آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

جولائی 2023

www.urducouncil.nic.in

قیمت : -/10 ₹

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس و ٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچّوں کا کتب خانہ

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ زبان شناسی

میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب

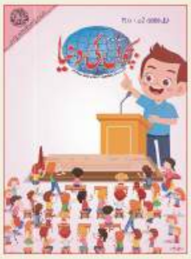

بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرِتعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326 A/C: ، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ : 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون: 24415194 - 040

آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ
خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد: 7   شمارہ: 7   جولائی 2023

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

معاون مدیر : ڈاکٹر مسرت

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارت تعلیم بحکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: الیس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی۔ 110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت: -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

صفحات: Total Pages **64**

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا
جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 49539000

نگارشات ارسال کرنے کے لیے

ای میل: kduniya@ncpul.in
editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002
فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

اداریہ

مشعل — مدیر — 4

شخصیت

مقبول تاریخ گو شاعرہ سیدہ — ڈاکٹر محمد مظاہر الحق — 5

نکہت سخن

شاعرات کے منتخب اشعار — 10

جہانِ نسواں

عطیہ پروین: عہد حاضر کی اہم افسانہ نگار — ڈاکٹر ظفر الاسلام — 11
اردو صحافت کا آغاز و ارتقا — ڈاکٹر سمیہ تمکین — 16
اردو میں نسائی مکتوبات — معراج الاسلام مصباحی — 23
خواتین اور فکشن — سعدیہ پروین — 28
خواتین تارکین وطن کار کن اور ان کے مسائل — آفرین بیگم — 33

سلسلۂ رباعیات

ڈاکٹر محمد اسلم پرویز کی شخصی رباعیات کا تنقیدی جائزہ — شاہینہ پروین — 39
عہد حاضر میں رباعی کے چند صاحب دیوان شعرا — خوشبو پروین — 44

حسن سخن

شبانہ عشرت، عائشہ دولت — 49

افسانہ

شام اور سمبل کے سائے — ڈاکٹر وفا یزدان منش — 51
مقابلہ — ڈاکٹر طلعت فاطمہ — 55
مورت — صاعقہ غیاث — 57

صحت

دانت کا درد — ابوسعدی خالد جاوید — 60

قارئین کے خطوط

مراسلہ — 62

مشعل

فضائی آلودگی نے انسانی زندگی کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ ہم قدرتی توازن کو برقرار رکھنے میں ناکام ہورہے ہیں جس کا خمیازہ موجودہ دور میں ہم سب کو بھگتنا پڑ رہا ہے۔ تیزی سے بڑھتی آبادی، شہروں کے پھیلاؤ، جنگلات کا کٹاؤ اور فضائی آلودگی نے ماحولیات میں بہت سے سنگین مسئلوں کو جنم دیا ہے۔

اس وقت ہماری زمین، ماحولیاتی خطرات سے دوچار ہے۔ جنگلات کی کٹائی، ایندھن، گاڑیوں سے نکلنے والا دھواں اور آلودہ پانی سے ہمارے ماحول کو بہت سے خطرات لاحق ہورہے ہیں۔ فیکٹریوں سے نکلنے والے دھوئیں سے آب وہوا متاثر ہورہی ہے اور ماحول میں کثافت پھیل رہی ہے۔ پیڑ پودوں کے کاٹنے اور فیکٹریوں سے نکلنے والے دھوئیں سے انسانی زندگی پر منفی اثرات مرتب ہورہے ہیں۔

صاف ستھرا ماحول مہیا کرانا ہم سب کی ذمہ داری ہے۔ آلودہ پانی سے شرح اموات میں بہت اضافہ ہوا ہے۔ پیڑ پودوں کو کاٹنے سے پانی کے بہاؤ میں مزید اضافہ ہورہا ہے۔ جنگلات پانی کی روک تھام میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ پیڑ پودوں کی موجودگی پانی کے بہاؤ کو کم کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ اگر جنگلات نہ ہوں تو جانوروں کا رہنا بھی دوبھر ہوجائے۔ ماحولیاتی آلودگی کے سبب انسانی زندگی بری طرح متاثر ہورہی ہے۔ مختلف بیماریوں سے انسانی زندگی پر منفی اثرات پڑ رہے ہیں۔ ماحولیات کے بحران پر اگر قابو نہیں پایا گیا تو آنے والی نسلوں کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑ سکتا ہے۔

ماحولیات کو قابو میں کرنے کے لیے ضروریات زندگی کو محدود کرنا ہوگا۔ عالمی سطح پر فضائی آلودگی کو ختم کرنے کے لیے بہت سے سنجیدہ اقدامات کیے جاسکتے ہیں۔ پرنٹ میڈیا، الیکٹرانک میڈیا، سوشل میڈیا اور دیگر ذرائع سے عوام کو بیدار کیا جاسکتا ہے۔ خواتین مختلف مہم کی شروعات کرکے ماحولیاتی آلودگی پر قابو پاسکتی ہیں۔ اس کے لیے انھیں بہت فعال ہونا ہوگا تبھی وہ معاشرے میں بھی بیداری لاسکتی ہیں۔

آپ کا

عقیل احمد

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

ڈاکٹر محمد مظاہر الحق

مقبول تاریخ گو شاعرہ سیدہ

محمد بہرام ولد یوسف علی رئیس تھلی، ایک درویش صفت بزرگ اور خدا رسیدہ انسان تھے۔ ان کی شادی فرزند علی صاحب کی دختر نیک اختر بی بی تائیدن سے ہوئی تھی۔ فرزند علی صاحب کا شمار رئیس تھلی میں ہوتا تھا۔

بی بی تائیدن کے بطن سے دو اولادیں پیدا ہوئیں۔ ان کے بڑے بیٹے کا نام عبدالوہاب تھا۔ ایک بیٹی 1878 میں پیدا ہوئی، جس کا نام سید النساء تھا۔

سید النساء کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ انھوں نے پہلے قرآن حکیم حفظ کیا۔ اس کے بعد اپنے والد سے اردو کی تعلیم حاصل کی اور حکیم لطیف احمد (م 1937) سے فارسی اور عربی کی تعلیم پائی۔ حکیم صاحب رشتے میں سیدہ کے خالو اور چچا بھی تھے۔

سید النساء کو بچپن ہی سے شعروادب سے گہری دلچسپی تھی اور کم عمری ہی سے شعر کہنے لگی تھیں۔ آگے چل کر حکیم لطیف احمد سے اصلاح لینے لگیں جس سے ان کے فن میں پختگی اور شاعری میں نکھار آ گیا۔ انھوں نے اپنا تخلص سیدہ رکھا۔ حکیم لطیف احمد ہی کی محبت کا یہ ثمرہ تھا کہ سیدہ نے قطعات تاریخ جیسی مشکل صنف پر طبع آزمائی کی اور اس میں مہارت بھی حاصل کی۔ اگر یہ کہا جائے کہ سیدہ ہند و پاک کی واحد شاعرہ ہیں جنھوں نے کثرت سے قطعات تاریخ رقم کیے تو غلط نہ ہوگا۔

سیدہ قطعات تاریخ حالات اور واقعات سے متاثر ہو کر لکھتی تھیں اور لوگوں کی فرمائش پر بھی۔ اس سلسلے میں اخبار ''تہذیب نسواں'' کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ ہر شمارے میں کسی نہ کسی کی فرمائش ضرور شائع ہوتی تھی کہ سیدہ بہن ہمارے یہاں یہ واقعہ یا حادثہ پیش آیا ہے۔ اس پر ایک قطعہ تاریخ کہہ دیں۔ اس کی تصدیق کے لیے یہاں دو خطوط درج کیے جاتے ہیں:

1 جناب مکرمہ ایڈیٹر صاحبہ تسلیم

میں آپ کو اس خوشی کی اطلاع نہیں دے سکی کہ میری دیورانی امراؤ بیگم صاحبہ پانی پتی بیگم محمد سلطان نعیم اللہ خاں صاحب کے یہاں خداوند کریم نے 4/رجب مطابق 12/جولائی بروز منگل دس بجے شب کو فرزند نرینہ عطا فرمایا۔ جس کا نام سلطان نسیم اللہ خاں رکھا گیا ہے۔ بہن سیدہ صاحبہ کی خدمت میں التماس ہے کہ برائے نوازش اس بچے کی ایک عمدہ سی تاریخ کہہ دیں۔ ایک روپیہ تہذیب فنڈ کے لیے ارسال خدمت ہے۔

راقمہ

گوہر سلطانہ، سہارن پور

2 میں اپنی قابل عزت بہن سیدہ صاحبہ کی خدمت میں سلام عرض کرتی ہوں۔ آپ کا پتہ یاد نہ رہنے کی وجہ سے اخبار ''تہذیب نسواں'' کو تکلیف دینی پڑی۔ چونکہ آپ ہماری پرانی مہربان تاریخ گو بہن ہیں۔ اس وجہ سے

بلاتکلف عرض کرتی ہوں کہ ایک تاریخ کی سخت ضرورت ہے۔ میری عزیز بھانجی کے یہاں نو برس بعد لڑکا ہوا ہے۔ پہلی لڑکی خدا کے فضل سے نو برس کی ہے۔ بچہ رمضان شریف کے شروع میں پیدا ہوا۔ شاید پہلی یا دوسری کو۔ آپ برابر میرے بھائی مولوی بشیر الدین احمد دہلوی صاحب قبلہ کے بچوں کی تاریخ ولادت لکھ کر بھیجتی ہیں۔ یہ میری بھانجی دراصل بھائی موصوف کی سگی بھانجی ہے۔ انھوں نے ہمیشہ آپ کی تاریخیں دیکھیں ہیں۔ آپ کی تاریخوں کو بہت پسند کرتی ہیں۔ اس واسطے میں آپ سے التجا کرتی ہوں کہ مہربانی فرما کر آپ اس نومولود کی عمدہ سی تاریخ ولادت کہہ دیں۔ بچہ کا تاریخی نام عبداللہ ریعین الحق رکھا ہے۔ دوسرا نام سکندر بخت بھی ہے۔ بچہ کی والدہ کا نام قیصری بیگم اور والد کا نام عبدالرب ہے۔ بہن کا نام محمدی بیگم ہے۔ قیصری بیگم مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم کی سگی نواسی ہیں۔

منتظر تاریخ

حامدہ دہلوی

سیدہ کو تاریخ گوئی کے فن میں خاص ملکہ حاصل تھا۔ انھوں نے کثرت سے قطعات تاریخ کہے۔ جن سے تہذیب نسواں لاہور کے اوراق بھرے پڑے ہیں۔ سیدہ کی کہی ہوئی پہلی تاریخ 1903 میں تہذیب نسواں میں شائع ہوئی۔ سیدہ ہر خاص و عام کے لیے قطعہ تاریخ لکھ دیا کرتی تھیں۔ انھیں قطعہ تاریخ کی فرمائش کا کس قدر پاس تھا، اس کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی ہوجاتا ہے کہ تہذیب نسواں میں کسی شخص نے قطعہ تاریخ کی فرمائش شائع کرائی مگر جب اس کی فرمائش پوری نہ ہوئی تو اس نے براہ راست سیدہ سے گذارش کی اور انھوں نے فوراً مطلوبہ تاریخ لکھ کر ''تہذیب نسواں'' کے دفتر کو روانہ کر دیا۔ اس قطعہ تاریخ کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

ہوئی سال و دعا کی فرمائش

اور بہنوں کے بعد جب ہم سے

بارہا ایسا بھی ہوا کہ موصوفہ نے قطعہ تاریخ لکھ کر روانہ کر دیا لیکن وہ کسی وجہ سے اخبار کے دفتر نہیں پہنچ سکا یا شائع نہ ہوسکا۔ قطعہ تاریخ کے خواہش مند حضرات نے سیدہ کی توجہ جب اس طرف مبذول کرائی تو دوبارہ قطعہ تاریخ تحریر کرنے کی زحمت سے موصوفہ کی پیشانی پر کبھی بل نہیں پڑتا تھا۔ وہ خندہ پیشانی سے دوبارہ قطعہ تاریخ کہہ کر روانہ کر دیتی تھیں۔ اس سلسلے میں یہاں چند اقتباسات تحریر کیے جاتے ہیں۔

3 ''بہن اصغری بیگم صاحبہ 16 رجنوری کے پرچے میں یاد دلا رہی ہیں کہ ان کی بچی صالحہ سلمہا کی پیدائش کی تاریخ لکھنا میں بھول گئی۔ اگر فرمائش آئی ہوگی تو تاریخ ضرور لکھی گئی ہوگی لیکن ممکن ہے نہ چھپی ہو۔ اس لیے امید کرتی ہوں کہ بہن موصوفہ برائے مہربانی یہ لکھیں کہ کس مہینے کی کس تاریخ میں وہ فرمائش شائع ہوئی تھی اور اس کے ساتھ بچی کا پورا حلیہ بھی لکھیں گی تا کہ تاریخ لکھنے میں آسانی ہو۔'' سیدہ

4 ''تہذیب مورخہ 30 جولائی سے معلوم ہوا کہ بہن عالیہ بیگم صاحبہ نے اپنے کسی عزیز کی تاریخ ولادت کی فرمائش کی تھی جس کی تعمیل نہیں ہوسکی۔ مجھے کچھ خیال نہیں ہے کہ کب فرمائش شائع ہوئی تھی اگر فرمائش ہوئی ہے تو تاریخ لکھ کر دفتر تہذیب میں روانہ ہوئی ہوگی ممکن ہے کسی وجہ سے اس کی اشاعت رہ گئی ہو۔ بہرکیف اب برائے مہربانی جس کی تاریخ مطلوب ہے اس کا ماہ سن و تاریخ اور اس کے اقران کا نام وغیرہ کل تعریف لکھ کر بہن عالیہ آئندہ کے پرچے میں شائع کرائیں تا کہ تاریخ لکھ کر روانہ کردی جائے۔ سیدہ

سیدہ کی ذات حرص و ہوس سے پاک تھی۔ موصوفہ کثرت سے فرمائش قطعہ تاریخ کی تعمیل کیا کرتی تھیں لیکن اس کے عوض کسی سے کچھ لینا ان کی طبیعت کو گوارا نہ تھا۔ حالانکہ موصوفہ کے پاس ایسے بیشتر خطوط آتے رہتے تھے جن میں قطعہ تاریخ تحریر کرنے کے عوض حق محنت ادا کرنے کی پیش کش بھی ہوتی تھی۔ ایسے خطوط سے موصوفہ کی طبیعت کس قدر مکدر ہوجاتی تھی۔ اس کا اندازہ درج ذیل اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے:

5 ''باوجود اس کے کہ میں اکثر وقتاً فوقتاً لکھتی آئی ہوں کہ میں تعمیل فرمائش کو (جو تاریخ کے لیے اکثر بہنوں کی طرف سے ہوتی ہے) اپنا فخر سمجھتی ہوں کیونکہ میں اس قابل نہیں کہ اس کام کے لیے انتخاب فرمائی جاتی مگر یہ قدردان بہنوں کی وفور مہربانی ہے جس کا شکریہ ادا نہیں ہوسکتا ہے۔ اس پر بھی اکثر بہنیں فرمائش کے ساتھ یہ طمع دکھلاتی ہیں کہ اس تاریخ کے صلے میں یہ دوں گی وہ دوں گی۔ خدا جانے اس بےضرورت و بےکار وعدوں میں

ہماری بہنیں کون سا نفع خیال کرتی ہیں۔ حالانکہ ان لوگوں کو خوب معلوم ہے کہ نہ مجھ کو کچھ طمع ہے نہ ان کو کچھ دینا ہے۔ سیدہ

سیدہ نہ صرف قطعہ تاریخ کی فرمائش کو پورا کرنے میں پیش پیش رہتی تھیں بلکہ دوسروں کی تکالیف کے ازالے کی حتیٰ المقدور کوشش بھی کیا کرتی تھیں۔ اگر انھیں اپنی جیب خاص سے کچھ دینا بھی پڑتا تھا تو وہ پیچھے نہیں رہتی تھیں۔ اس ضمن میں سیدہ کا خط دیکھیں۔

6 ''30 جولائی کے پرچے میں ایک گمنام بہن نے اپنے دانتوں کی شکایت لکھی ہے۔ اس کی دوا چاہتی ہیں۔ بہن موصوفہ اگر اپنے پورے پتے سے بذریعہ تہذیب یا براہ راست مجھ کو مطلع کریں تو میں تجربہ کے لیے تھوڑا منجن جو دانت کی شکایتوں کے لیے نافع ہے، مفت روانہ کردوں بعد معلوم ہونے نتیجہ کے پھر مجھ کو لکھیں۔ میرا پتہ ذیل میں ہے۔

سیدہ ساکن تھہلی، ضلع سارن، ڈاکخانہ برہڑیا،
برمکان حکیم لطیف احمد'' سیدہ

مستورات کے دل میں یہ خواہش موجزن رہتی ہے کہ وہ جاذب نظر دکھائی دیں۔ اس کے لیے وہ آزمودہ ابٹن یا لوشن کا سہارا لیتی ہیں۔ سیدہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھیں۔ وہ ابٹن کا استعمال کیا کرتی تھیں۔ اس سلسلے میں پیش ہے سیدہ کا یہ خط جس میں ان کے آزمودہ ابٹن کا ذکر ہے۔

7 ''بہن م ن صاحبہ نے پوچھا ہے کہ کسی بہن کو کوئی بہت اچھا ابٹنا معلوم ہو تو اس کی ترکیب ''تہذیب نسواں'' میں لکھیں۔ میں ایک ترکیب لکھتی ہوں۔ یہ میری خوب آزمائی ہوئی ہے۔ اس سے منہ کے داغ دھبے، چھائیاں، دانے سب رفع ہوجاتے ہیں اور چہرہ بالکل صاف ہوجاتا ہے۔ ترکیب یہ ہے۔ حسن یوسف سمندری جھاگ، دارچینی، نیم کے خشک پتے، چرونجی، نارنگی کے خشک چھلکے، ہارسنگھار کے خشک پھول۔ یہ سب چیزیں ایک حصہ لے لیں اور جَو کا آٹا دس گنا۔ سب دواؤں کو کوٹ کر خوب مہین کرلیں اور جَو کے آٹے میں ملا رکھیں۔ جب جی چاہے حسب ضرورت پانی میں گھول کر کسی قسم کا تھوڑا سا تیل ملا کر ابٹنا کی طرح ملیں۔'' سیدہ

سیدہ قلمی دوستی کرنے میں بھی پیش پیش رہتی تھیں۔ اس ضمن میں شمس العلماء مولوی نذیر احمد کی چھوٹی نواسی کا یہ خط ملاحظہ ہو:

8 '' بہن سیدہ صاحبہ تسلیم

آپ کی چند سطور کل ''تہذیب نسواں'' میں دیکھیں، جنھیں پڑھ کر بے حد مسرت ہوئی۔ آپ بے تامل سلسلہ مراسلات جاری کرسکتی ہیں۔ میں بہت خوشی سے فوراً جواب دیا کروں گی۔ میں شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب ایل ایل ڈی کی چھوٹی نواسی ہوں اور میرا پتہ یہ ہے۔ مسز انتظام الدین حسن ایم اے، پلی اسٹیشن روڈ، حیدرآباد دکن۔''

سیدہ کو کتب کے مطالعہ کا شوق جنون کی حد تک تھا۔ موصوفہ نے اپنے شوق کی تکمیل میں کتابوں کی قیمت کو کبھی حائل نہیں ہونے دیا۔ کتابوں سے انھیں والہانہ عشق تھا اور انھیں کوئی شخص کتاب نذر کرتا تو وہ خندہ پیشانی سے قبول کرلیا کرتی تھیں۔ ملاحظ ہو:

9 ''بہن چھوٹی دلہن صاحبہ اہلیہ بشیر الدین صاحب نے تو بیسوں روپے کی کتابوں سے مجھے زیر بار منت فرمایا۔ اس پر بھی دم لینے کی روادار نہیں ہوتی ہیں۔''

سیدہ کو عورتوں سے متعلق اخبار اور رسائل کے فروغ سے ایک والہانہ لگاؤ تھا۔ وہ اس قسم کے اخبار اور رسائل کو نہ صرف یہ کہ خرید کر پڑھتی تھیں بلکہ ان کی حتی المقدور مدد بھی کیا کرتی تھیں۔ ''تہذیب نسواں'' میں ایک کالم ''محفل تہذیب'' ہوا کرتا تھا جس میں قطعات تاریخ کی فرمائش شائع ہوتی تھی۔ قطعہ تاریخ کی فرمائش کرنے والے ایک روپیہ ''تہذیبی فنڈ'' کے لیے بھیجتے تھے۔ چنانچہ وہ کثرت سے قطعات تاریخ کی فرمائش کی تکمیل کیا کرتی تھیں جس سے ''تہذیب نسواں'' کو اچھی خاصی آمدنی ہوجایا کرتی تھی۔ بقول منیجر ''تہذیب نسواں'':

10 ''بہن سیدہ منجملہ ان ارکان تہذیب کے ہیں جنھیں تہذیب کی روح رواں کہنا چاہئے۔ ان کی تاریخوں کے ذریعہ جو مالی مدد تہذیبی فنڈ کو ملتی ہے وہ بے انتہا شکریہ کے قابل ہے۔ تاریخوں کا شکرانہ اخلاقی لحاظ سے ہر طرح ان کا حق تھا۔ ان کی کمال سیر چشمی اور ہمدردی تہذیب ہے کہ انھوں نے اپنا وہ حق بالکل تہذیبی فنڈ کے لیے چھوڑ دیا ہے۔''

''تہذیب نسواں'' میں چند خطوط ایسے بھی شائع ہوئے جن میں سالانہ انعام کا سلسلہ شروع کرنے کی فرمائش کی گئی تھی۔ انعام کے

اخراجات کہاں سے پورے کیے جائیں اس پر مختلف لوگوں نے مختلف تجویزیں پیش کیں۔اس ضمن میں سیدہ کی ترقی تعلیم نسواں کی تجویز ان کے قلبی لگاؤ کو ثابت کرتی ہے۔موصوفہ اس موقع پر اپنی طرف سے مالی امداد دینے میں کسی سے پیچھے نہیں رہیں۔اس سلسلے میں چند سطور ملاحظہ ہوں:

11 ’’یہ رائے تو بہت اچھی تھی کہ تہذیبی فنڈ سے انعام مقرر کیا جاتا مگر اس میں مشکل یہ ہے کہ تہذیبی فنڈ کی آمدنی بھی کچھ ایسی کافی نہیں ہے کہ اس بار گراں کی متحمل ہوسکے۔اس صورت میں بھی جناب منیجر کی سبک دوشی کی امید نہیں۔ جب تک کوئی مستقل آمدنی کی صورت نظر نہ آئے یہ مشکل ہے۔ان سب دقتوں کو مدنظر رکھ کر ہماری رائے تو یہ ہے کہ ہر خریدار تہذیب کے اوپر اک اک آنہ انعامی چندہ مقرر کردیا جاتا اور اس کی ادائے گی یا اس کی وصولی شامل چندہ سالانہ تہذیب لازمی واجبی قرار دی جاتی۔

ہر خریدار سالانہ یک مشت ایک دفعہ ادا کیا کرے......ابتدا میں 8 صفحے کا تہذیب جاری ہوا تھا۔ بعد اس کے بارہ صفحے ہوگئے پھر یہ اخبار 16 صفحے کا ہوا اور اب ماہ گزشتہ جولائی سے 20 صفحے کا ہوگیا، اور قیمت ہے کہ شروع سے آج تک وہی سواتین کی سواتین۔ترقی کے حساب سے اس وقت سات آٹھ روپے ہونا چاہیے۔ اس حالت میں اب اس وقت جو انعام کی مد قائم ہوئی ہے (وہ انعام بھی کس کو) اس میں اک اک آنہ سالانہ ٹیکس دینا کسی کو بار خاطر ہونے کی وجہ نہیں ہے اور یہ ٹیکس کیا ہے خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے۔‘‘

سیدہ کو تعلیم نسواں کے فروغ سے نہ صرف دلچسپی تھی بلکہ اس سے انھیں خاص رغبت تھی۔انھوں نے اپنی عمر کا بڑا حصہ عورتوں میں تعلیم کا شوق اورادبی ذوق بیدار کرنے میں لگا دیا۔اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ان کی زندگی کا نصب العین ہی یہ تھا کہ مستورات علم کی دولت سے مالا مال ہوجائیں۔انھوں نے خود اپنے گھر پر تعلیم نسواں کا نظم کر رکھا تھا اس ضمن میں مولوی سبحان احمد فرماتے ہیں:

12 ’’سیدہ کا گھر کسی مدرسے سے کم نہ تھا۔جب تک پڑھنے والیوں کی تعداد کم رہی خود پڑھایا کرتی تھیں لیکن جب پڑھنے والیوں کا اضافہ ہوا تو استانی رکھ لی۔ جسے جیب خاص سے تنخواہ دیا کرتی تھیں۔ پڑھنے والیوں سے فیس کے نام پر ایک پیسہ نہیں لیتی تھیں بلکہ مفلس ونادار بچیوں کو اپنے جیب خاص سے کتابیں خرید دیا کرتی تھیں۔‘‘

سیدہ دیندار متقی اور پرہیزگار خاتون تھیں۔نماز پابندی سے پڑھا کرتی تھیں۔کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنے ہوش میں کبھی نماز قضا نہ کی۔ روزے بھی اسی طرح پابندی سے رکھتی تھیں۔انھیں غریبوں اور ناداروں کی مدد کرنے میں ایک قسم کی روحانی تسکین ملتی تھی۔سیدہ سے مستفیض ہونے والوں کی ایک طویل فہرست ملتی ہے۔اس ضمن میں مولوی سبحان احمد کا کہنا ہے کہ ماہ رمضان المبارک میں خیرات مانگنے والوں سے قطع نظر عام دنوں میں بھی سیدہ کے گھر پر حاجت مندوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔

سیدہ کو بشیر الدین احمد دہلوی کے خاندان والوں سے والہانہ محبت تھی اور یہ بھی حقیقت ہے کہ سیدہ نہ کبھی بشیر الدین احمد دہلوی کے دولت کدے پر گئیں اور نہ بشیر الدین احمد دہلوی کبھی سیدہ کے مکان پر تشریف لائے۔غرض کہ دونوں ایک دوسرے کی صورت سے ناآشنا تھے۔اس کے باوجود سیدہ کو بشیر الدین اور ان کے خاندان والوں سے ایک قلبی لگاؤ تھا۔ اس کا اندازہ اس بات سے بخوبی ہوجاتا ہے کہ جب بشیر الدین احمد دہلوی کے یہاں بیٹے کی ولادت ہوئی تو موصوف نے خط کے ذریعہ حکیم لطیف احمد کو اطلاع دی۔حکیم صاحب نے مذکورہ خط سیدہ کو دکھلایا۔اس خط کو پڑھ کر موصوفہ کس قدر خوش ہوئیں اس کا اندازہ حکیم لطیف احمد کے خط سے لگایا جاسکتا ہے جو موصوف نے بشیر الدین احمد دہلوی کو لکھا تھا۔ملاحظہ ہو:

13 ’’فوراً ہم نے اس کارڈ کو لے جاکر سیدہ کو دکھلایا۔بہت خوش ہوئیں۔بچے اورزچے کے حق میں دعا کرنے لگیں۔‘‘

سیدہ کی شادی عبدالحمید صاحب سے ہوئی جو رشتے میں سیدہ کے چچازاد بھائی بھی تھے۔سیدہ کو اولاد کی خوشی میسر نہ ہوئی۔ان کی زندگی ہی میں ان کے شوہر کا انتقال ہوگیا۔حکیم لطیف احمد نے قطعہ تاریخ وفات لکھا ملاحظہ ہو:

تاریخ ہفدم تھی محرم کی وقت شب
عبدالحمید جبکہ ہوئے داخل بہشت
کیا اِن سے اُن سے آپ سے پوچھیں ہم اے لطیف
سال ان کے انتقال کا ہے۔ داخل بہشت

1322ہجری

سیدہ کی صحت ہمیشہ خراب رہا کرتی تھی۔ چنانچہ وہ تمام عمر کسی نہ کسی مرض میں مبتلا رہیں۔بعض مرض تو تاحیات ان کے ساتھ رہا۔یہی وجہ تھی کہ ان کے جسم کو کبھی موٹاپا چھو نہ سکا۔سیدہ کا یہ خط ملاحظہ ہو:

14 ''جن جن بہنوں کی دعاؤں سے میں تین مہینے کی علالت سخت جھیل کر اٹھ کھڑی ہوئی ہوں اور جن بہنوں نے ازروئے اخلاق بذریعہ خط میری عیادت کی ان کا شکریہ اگرچہ تہہ دل سے تعلق رکھتا ہے مگر اس کا عدم اظہار بڑی ناشکری کی بات ہے اور ابھی میں اس قابل نہیں کہ سب کسی کو خط لکھ سکوں۔ اس لیے مجبوراً بذریعہ اس تحریر کے (جو دوسرے کے ہاتھوں لکھوا رہی ہوں) معافی کی خواستگار ہوں۔ بوجہ غلبہ طاعون کے ماہ فروری میں ہم لوگ گھر سے باہر رہے اور اسی دن گھر سے باہر ہونے کے بعد ٹٹی کے مکان میں سخت بیمار ہوئی اور انواع انواع کی علالت خطرناک مایوسانہ جھیلتی رہی۔ 4 کم 100 دن میعاد جلاوطنی کاٹ آخر ماہ مئی میں بخیریت گھر واپس آئی.....'' سیدہ

ایڈیٹر ''تہذیب نسواں'' کو سیدہ کی علالت سے کس قدر تشویش تھی اس کا اندازہ اس اپیل سے لگایا جاسکتا ہے جس میں قارئین سے سیدہ کی صحت یابی کی دعا کرنے کی درخواست کی گئی تھی۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

15 ''تہذیبی بہنوں کو اس بات کے معلوم ہونے سے بہت رنج ہوگا کہ محترمہ سیدہ صاحبہ (تتھلی) عرصہ سے علیل چلی آتی ہیں۔ ماہ مئی میں کچھ اچھی رہیں لیکن بعد میں معدے کی خرابی میں ایسی مبتلا ہوئیں کہ آج تک نجات نہیں ملی۔ انھیں عارضہ اسہال سے بہت ضعف ہوگیا ہے۔ غذا صرف شوربا یا ساگودانہ رہ گیا ہے۔ چلنے پھرنے کی طاقت بالکل نہیں رہی۔ بہن موصوفہ کی یہ حالت ہمارے لیے نہایت رنج دہ ہے اور جب سے ہمیں یہ معلوم ہوا ہے نہایت فکر لاحق ہے۔

سیدہ صاحبہ ''تہذیب نسواں'' کی نہایت قدیم معاون اور اس کی سچی قدرداں ہیں۔ انھیں تہذیبی بہنوں سے بے انتہا محبت اور ہمدردی ہے۔ وہ ہم سے سینکڑوں کوس دور ہیں مگر ہر تہذیبی بہن کے بیاہ شادی، خوشی اور غم میں اپنے بے نظیر تاریخی قطعات کے ذریعہ دلچسپی لیتی ہیں اور سچ پوچھوں تو محفل تہذیب کی رونق انھیں کے دم سے ہے۔ خداوند کریم سے ہماری دعا ہے کہ وہ ان کے حال پر رحم فرمائے اور انھیں جلد صحت کامل بخشے۔

تہذیبی بہنوں کی خدمت میں التماس ہے کہ ان کے لیے خاص طور پر نماز پنجگانہ کے بعد دعا کریں...... ہم تہذیبی بہنوں کو ان کی صحت کے حالات سے ہفتہ وار خبر دیتے رہیں گے۔ ایڈیٹر

17/اپریل 1930 مطابق 1348 ہجری بروز جمعرات 8 بجے صبح سیدہ نے اس دارفانی سے کوچ کیا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر 52 سال کی تھی۔ وہ تتھلی میں واقع اپنے خاندانی قبرستان میں دفن کی گئیں۔ حکیم لطیف احمد نے قطعہ تاریخ وفات کہا۔ ملاحظہ ہو

کیونکر لکھیں لکھا نہیں جاتا ہے کیا لکھیں
بیوقت سیدہ کا ہوا ہائے انتقال
فی الحال کچھ لطیف حزیں سے نہ پوچھیے
افسوس غم ملال میں مرحومہ کا ہے سال
1348 ہجری

حواشی

1 ''تہذیب نسواں''، 29/اگست 1910، صفحہ 417
2 ''تہذیب نسواں''، 17/اگست 1981، صفحہ 567 تا 568
3 ''تہذیب نسواں''، 6/فروری 1909، صفحہ 72
4 ''تہذیب نسواں''، 17/ستمبر 1910، صفحہ 456
5 ''تہذیب نسواں''، 17/ستمبر 1910، صفحہ 46
6 ''تہذیب نسواں''، ۱۷/ستمبر 1910، صفحہ 445
7 ''تہذیب نسواں''، یکم جنوری 1910، صفحہ 12
8 ''تہذیب نسواں''، 29/اگست 1908، صفحہ 416
9 ''تہذیب نسواں''، 17/ستمبر 1910، صفحہ 446
10 ''تہذیب نسواں''، یکم اکتوبر 1910، صفحہ 470
11 ''تہذیب نسواں''، 11/اکتوبر 1910، صفحہ 469
12 راقم الحروف کو یہ بات دوران گفتگو بتائی تھی
13 مملوکہ حاجی انوار احمد، پٹنہ
14 ''تہذیب نسواں''، 24 جون، 1911، صفحہ 304
15 ''تہذیب نسواں''، 23 ستمبر، 1911، صفحہ 467

Dr. Md. Mozaherul Haque
Shaheen Manzil, Nowgharwa,
Sultanganj,
Patna - 800006 (Bihar)
Mob. 7903347365

شاعرات کے منتخب اشعار

تھی وہ نگاہ ناز یا ناوک کا تیر تھا
ملتے ہی آنکھ رہ گیا میں کہہ کے ہائے دل

سلطان بیگم سلطان

کچھ اس قدر میں کھو گئی تیرے خیال میں
معلوم خود نہیں ہوئی اپنی خبر مجھے

ممتاز جہاں ناز

اب نہ لکھوں گی عمر بھر ان کو میں دل کا زار
اب نہ بناؤں گی کبھی میں انھیں دل کا راز دار

کنیز فاطمہ حیات

کچھ نہیں چاہتی مگر اک نگہ غلط اثر
ہمت اعتراف ہو جس سے اب گناہ میں

عابدہ خاتون پروین

پشیماں ہو رہی ہوں شکوۂ جور و جفا کر کے
کوئی ہوگا پشیمان شکایت میں نہ سمجھی تھی

سائرہ

میں آپ دکھاتی تھی سو رنگ کے جلوے
تم حسرت دیدار کا اظہار نہ کرتے

ظریفہ

مگر ناواقف رمز گداز و سوز تھا نغمہ
صباحت سے سحر اور رنگ و بو سے گل تہی داماں

خورشید آرا بیگم خورشید

زندگی میری کہیں حرف مکرر تو نہیں
برق کیوں ڈھونڈتی پھرتی ہے نشیمن میرا

خالدہ بیگم خالدہ

ہیں نگاہ جوشش حرماں سے خون دل میں نم
مردم چشم لہو آمیز ہے حسرت نسیم

رابعہ خاتون پنہاں

شعلۂ شمع فروزاں سے نہیں اتنی تپش
گرمیٔ شوق شہادت ہے کہ گھبراتا ہے تو

ام الشہاب زیب

صد سوزش جرأت و صد سوزش فراق
امید چارہ سازیٔ بیمار الوداع

وحید النساء وحید

قید حیات میں تو کرتا ہے فکر راحت
دیوانے ہنس پڑیں گے سن کر خیال تیرا

طاہرہ خاتون شبنم

آپ اپنے پہ رشک آتا ہے
کہ تمنائے یار کرتے ہیں

ج۔ بیگم اختر صدیقی

منظور نہیں مجھ کو تنک طرفیٔ منصور
دنیا پہ عیاں حال دل زار نہ کرتے

ظریفہ

ہر ایک حرف آرزو کو داستاں کیے ہوئے
زمانہ ہو گیا ہے ان کو مہماں کیے ہوئے

عزیز جہاں ادا بدایونی

اگر یہ پائے ہمت جانب منزل رواں ہوگا
تو ہر خار بیاباں رشک گلہائے جناں ہوگا

آمنہ خاتون صفت

(ماخذ: تذکرۂ شاعرات اردو، محمد جمیل احمد، ایم۔اے۔ بریلوی، قومی کتب خانہ، بریلی، 1966)

ڈاکٹر ظفر الاسلام

عطیہ پروین
عہدِ حاضر کی اہم افسانہ نگار

تاریخ شاہد ہے کہ خواتین نے سیاست، معاشرت، علوم وفنون (مثلاً رقص وموسیقی) اور ادب میں مردوں سے کچھ کم حصہ نہیں لیا۔ علم وادب سے تو انھیں خاص شغف رہا کیوں کہ یہ ان کی فطرت کا حصہ ہے کہ وہ زندگی کے ہر شعبے میں حسن، جمالیات، خوبی اور خوبصورتی کو تلاش کرتی ہیں۔ چوں کہ ادب خود ایک جمیل شے ہے لہٰذا خواتین کی اس میں زیادہ دلچسپی اور شمولیت نظر آتی ہے۔ کبھی وہ یونان میں رقص موسیقی کی دیوی زہرہ کی پجاری کی حیثیت سے اس کی تعریف میں گیت گاتی ہیں۔ کبھی عربی شعرا کے دوش بدوش حسن وعشق کے راگ الاپتی ہیں۔ اسی طرح ادبی کاوشوں میں بھی ان کا حصہ کچھ کم نہیں رہا ہے۔ میرا بائی، نور جہاں اور زیب النساء کے نام آج بھی قدیم ہندوستان کی ادبی تاریخ میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ فطری صلاحیت اور دماغی قابلیت میں صنف نازک، صنف رجال سے کسی طرح بھی کم نہیں رہی ہیں بلکہ جب بھی انھیں موقع ملا ہے انھوں نے اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھلائے ہیں۔

علامہ راشد الخیری کو ہم اس لیے خواتین کا سب سے بڑا پیشوا خیال کرتے ہیں کہ انھوں نے نہ صرف اپنی تحریروں کے ذریعہ پردہ نشین مسلمان خواتین کی توجہ گھریلو تعلیم کی جانب مبذول کرائی بلکہ انھیں خود بھی لکھنے کا موقع فراہم کیا۔ ان کی تقلید میں چند گھریلو تعلیم یافتہ عورتوں کو اپنی صنف کی رہنمائی کا موقع نظر آیا اور وہ اس قسم کے مضمون، کہانی لکھنے کی جانب مائل ہوئیں جن میں ان کے گھریلو مسائل اور ان پر ہو رہے ظلم وستم کو ظاہر کیا گیا ہو۔ اس فہرست میں سب سے پہلا نام محترمہ خاتون اکرم کا آتا ہے جنھوں نے ''بچھڑی بیٹی'' کے نام سے ایک کہانی تخلیق کی جسے طویل افسانے کی فہرست میں رکھا جا سکتا ہے۔ اس میں قصہ یعنی پلاٹ کو پر اثر طریقہ سے پیش کیا گیا ہے لیکن مکالمہ نگاری اور واقعات نگاری کے کمالات کچھ دبے سے رہ گئے ہیں۔ خاتون اکرم کی متعدد کہانیاں ماہنامہ عصمت اور تہذیب نسواں میں شائع ہوئیں۔ محض تیئیس برس کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا اور یہ سلسلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ اسی زمانے میں لطیف النسا بیگم نے ''من کی بپتا'' اور رابعہ بیگم نے ''سوتیلی ماں'' کے نام سے طویل افسانے تخلیق کیے۔ اس کے بعد اردو افسانے کی نسائی آواز میں

رشیدۃ النساء، صغرا ہمایوں مرزا، نذر سجاد حیدر، ڈاکٹر رشید جہاں اور رضیہ سجاد ظہیر کے نام سنہرے حروف سے لکھے جانے کے لائق ہیں۔

آزادی کے بعد کی خواتین قلم کاروں میں عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، ہاجرہ مسرور، شکیلہ اختر، خدیجہ مستور، صدیقہ بیگم، ممتاز شیریں، جیلانی بانو، صالحہ عابد حسین، واجدہ تبسم اور مسرور جہاں وغیرہ نے اردو فکشن کو اپنی خوبصورت کہانیوں سے لازوال بنا دیا۔ افسوس کہ ہر مصنف کی قسمت میں شہرت نہیں ہوتی۔ انھیں میں ایک نام ''عطیہ پروین'' کا بھی ہے۔ جن کی اردو خدمات کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ وہ 1969 سے مسلسل لکھ رہی ہیں۔ اب تک ان کے پینتیس ناول اور تقریباً تین سو افسانے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ وہ بچوں کے لیے تیس کتابیں اور متعدد کہانیاں لکھ چکی ہیں۔ انھوں نے مزاحیہ ادب بھی تخلیق کیا ہے، ان کا 'چچی چھمّن' نامی کردار خوب پسند کیا گیا۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعے بھی ان کے متعدد افسانے نشر ہو چکے ہیں۔ انھوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعہ اردو فکشن کو کافی فروغ دیا ہے۔ ان کے افسانے ملک کے معروف اور اہم رسائل و جرائد کی زینت بنتے رہے ہیں۔ ان کے ناول اور افسانے مسلم معاشرے کی منہ بولتی تصاویر ہیں اور یہی ان کے فکشن کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ ان کے متعلق ڈاکٹر عبیداللہ چودھری کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> ''یہ حقیقت ہے کہ عطیہ پروین کے افسانوں کا موضوع عورت کی زندگی سے تعلق رکھنے والا کوئی نہ کوئی المیہ یا حادثہ ہی ہوتا ہے۔ عورت خدا کی بنائی ہوئی بہترین تخلیق ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا، ان کے افسانوں کا پلاٹ عورت کی زندگی میں بکھرے ہوئے گھریلو حالات سے منتخب کئے گئے ہیں۔ انداز تحریر میں بھی گھریلو ماحول کا عکس ہی دکھائی دیتا ہے۔''

(اتر پردیش میں اردو افسانہ 1960 کے بعد، ڈاکٹر عبیداللہ چودھری 1993، ص 146)

عطیہ پروین کا اصل نام ''امت الازہرہ'' ہے لیکن ادبی دنیا میں وہ اپنی عرفیت ہی سے مشہور ہیں۔ ان کی پیدائش اتر پردیش کے ادبی و تاریخی قصبہ بلگرام ضلع ہردوئی کے ایک علمی، ادبی، زمیندار، سادات خاندان میں ہوئی۔ والد گرامی کا نام 'سید محمد باقر حسین' تھا۔ اردو سے محبت اور خاندان کے ادبی ماحول نے انھیں بچپن ہی سے پڑھنے لکھنے کی طرف مائل کیا۔ حالانکہ انھوں نے اپنی بیش تر تعلیم پرائیویٹ طور پر اپنی ذاتی لگن سے حاصل کی۔ کم عمری سے ہی لکھنے کی شروعات کی اور محض تیرہ برس کی عمر میں پہلا افسانہ تخلیق کیا۔ اس کے بعد وہ مسلسل کہانیاں لکھتی رہیں۔ اپنے پہلے افسانے سے متعلق وہ کہتی ہیں:

> ''اپنا پہلا افسانہ میں نے 13 برس کی عمر میں لکھا تھا اور اس فضا میں اس ماحول میں، اس پابندی میں، جہاں کہ لڑکیوں کا لکھنا معیوب سمجھا جاتا تھا، بڑی ڈانٹ پڑی، پھر بھی میرے دل میں یہ خواہش کروٹیں لیتی رہی کہ کچھ لکھوں۔''

(''یہ میرا ظرف دیکھ'' نامی پریس لکھنؤ 1986، ص: 5-6)

ان کے شوق کو دیکھتے ہوئے والد نے انھیں قلم اٹھانے کی اجازت دے دی، مگر خاندان کی کچھ بڑی بوڑھیوں کو ان کی ادبی آزادی پسند نہ آئی لیکن والد گرامی کی ہمت افزائی کی وجہ سے انھوں نے تخلیقی سلسلہ جاری رکھا۔ شادی کے بعد شوہر بھی مکمل طور پر ہم سفر ثابت ہوئے۔ وہ ان کے ادبی ذوق سے بہت خوش تھے۔ انھوں نے ان کی کئی کتابیں خود شائع کروائیں۔ مگر افسوس کہ زندگی نے انھیں زیادہ موقع نہ دیا اور وہ مارچ 1989 میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ شوہر کے انتقال کے بعد عطیہ پروین کا قلم برسوں خاموش رہا۔ مگر دوستوں کی ہمت افزائی اور مسلسل اصرار نے ان کو دوبارہ قلم پکڑنے پر مجبور کیا۔ لہٰذا وہ پھر سے اپنی پرانی روش یعنی افسانہ نگاری کی طرف لوٹ آئیں۔ شوہر نامدار کے انتقال کے بعد وہ ماہنامہ ''بیسویں صدی'' کے مدیر کے نام ایک خط میں لکھتی ہیں:

> ''محترم رحمٰن بھائی تسلیمات،
> افسانہ 'پی کہاں' کے تعلق سے آج کل تعریفی خط موصول ہو رہے ہیں۔ یہ ایک تازہ افسانہ 'نہ پہچانا' ارسال خدمت ہے۔ امید ہے پسند آئے گا۔ لکھنا تو بہت چاہتی ہوں رحمٰن بھائی مگر قلم اٹھاتی ہوں تو عجیب سا دل ہو جاتا ہے۔ خدا معلوم کیا کیا یاد آنے لگتا ہے، بس لکھنا بند کر دیتی ہوں۔ خدا سے دعا کیجئے کہ مجھے سکون ملے۔ مارچ میں میرے سرتاج کو مجھ سے جدا ہوئے ایک سال پورا ہو جائے گا۔ لگتا ہے ابھی کل ہی کی بات ہے۔ دل اب بھی نہیں مانتا کہ وہ میرے ساتھ نہیں ہیں۔ عجیب سی زندگی گذر رہی ہے۔'' (آپ کی بہن: عطیہ پروین)

(ماہنامہ ''بیسویں صدی'' افسانہ نمبر، جولائی 1990، ص: 83)

عورت دنیا کی سب سے خوبصورت شے ہے۔ لہٰذا عطیہ پروین کی کہانیوں میں عورت عام طور سے مرکزی کردار کے روپ میں پیش کی گئی ہے۔ انھوں نے عورت کے تقدس اور عظمت کو اہم ثابت کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ وہ اپنے افسانوں کا پلاٹ عورت کی زندگی سے تعلق رکھنے والے کسی واقعے یا حادثے سے اخذ کرتی ہیں۔ ان کی بیش تر کہانیاں عورت

کی زندگی میں بکھرے ہوئے روزمرہ کے معاملات پر مشتمل ہیں۔انداز بیان میں بھی گھریلو ماحول کا عکس صاف نظر آتا ہے۔ان کا انداز بیان بھی بالکل سادہ اور عام فہم ہوتا ہے۔ایک مقام پر وہ خود لکھتی ہیں:

''میں عورتوں کی عزت اور اہمیت پر زور دیتی ہوں،عورت کائنات کی سب سے بہتر تخلیق ہے یہ ضرور ہے کہ کچھ عورتیں اپنے آپ کو اس اونچے مقام سے گرا کر چلی آتی ہیں۔ میں انھیں اٹھانے اور ان کے اندر کی اچھی عورت کو جگانے کی کوشش کرتی ہوں۔میرے ہر افسانے میں کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے۔'' (''یہ میرا ظرف دیکھ''ص:5-6)

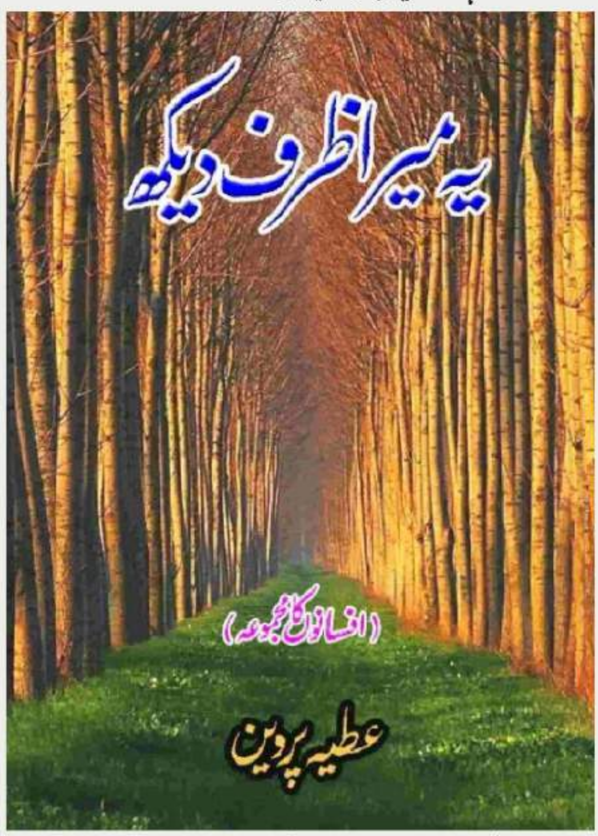

ان کی متعدد تصانیف پر ایوارڈ بھی دیے جا چکے ہیں۔ان میں 'یوپی اردو اکیڈمی' سے چھ ایوارڈ۔ بچوں کی کتاب ''سونے کی تجوری'' اور ''پکھراج'' پر بہار اردو اکیڈمی ایوارڈ۔''یہ میرا ظرف دیکھ'' پر فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی ایوارڈ۔اس کے علاوہ ان کی کتابوں کے تراجم پنجابی اور ہندی میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔مختلف افسانوں کے ترجمے تامل اور تیلگو زبانوں میں کیے گئے ہیں۔

ہماری معلومات کے مطابق ان کا واحد افسانوی مجموعہ ''یہ میرا ظرف دیکھ'' فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی حکومت اتر پردیش کے مالی تعاون سے 1986 میں شائع کیا گیا ہے۔ زیر نظر مجموعے میں انیس افسانے شامل ہیں۔ان افسانوں کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حقیقت پسندی کی فنکارانہ روش کے ساتھ ساتھ اردو فکشن کے وقار کو بلندی عطا کرنے میں اردو کی اہم خواتین فکشن نگاروں میں 'عطیہ پروین' نے بھی اہم کام کیا ہے۔ان کی تخلیقی اہمیت وافادیت اور اس کی وضاحت کے لیے ان کے افسانوں پر سرسری نظر ڈالنا ضروری ہے۔

''وہ ایک نشانی تیری'' اس افسانہ میں شوہر 'انور میاں' اور بیوی 'بانو' کی پاک اور بے لوث محبت کا بیان ہے۔کہانی دونوں کی محبت کے اردگرد گھومتی نظر آتی ہے۔رات کو نیند میں ہی شوہر کا انتقال ہو گیا۔غم اس قدر گہرا تھا کہ 'بانو' کی آنکھوں کا پانی خشک ہو گیا۔اس طرح ماضی کو یاد کر کے وہ مزید پریشان ہو گئی۔آخری بار وہ رات میں روزانہ کے معمول کے مطابق ہنستے مسکراتے سوئے تھے مگر صبح میں بیگم کے لاکھ جگانے پر بھی وہ نہیں اٹھے۔جب بیوی نے انھیں چھو کر دیکھا تو وہ بالکل ٹھنڈے ہو چکے تھے۔رات میں نہ جانے کب ان کی موت ہو گئی تھی۔ بیوی اس صدمے کو برداشت نہیں کر سکی اور بالکل خاموش ہو گئی۔ یہاں تک کہ اس نے اپنی زبان سے ایک آہ تک نہ نکالی۔سارے عزیز، رشتہ دار، بچے یہاں تک کہ ڈاکٹر بھی ہار گئے مگر ان کی خاموشی کو نہیں توڑ پائے۔اس افسانے میں عورت کے جذبات اور اس کے رنج کا اظہار بڑے دردناک انداز میں کیا گیا ہے۔دوسرے دن 'بانو' اپنے شوہر کے ساتھ گزارے گئے ماضی کے دریچے میں جھانکنے لگی اور ان باتوں کو یاد کر کے اور بھی بے چین ہو گئی۔رات میں شوہر نے اس سے کھیر مانگ کر کھائی تھی۔اچانک اس کی نظر چینی کی اس پلیٹ پر پڑی جس میں کھیر کھائی گئی تھی۔'انور میاں' نے اس پلیٹ کو چارپائی کے نیچے کھسکا دیا تھا۔'بانو' نے اسے اٹھا کر سینے سے لگایا، اس جذباتی اقتباس کو ملاحظہ کریں:

''(بانو) بجلی کی طرح اٹھیں،لپکیں اور اس جوٹھی،مکھیاں بھنکتی پلیٹ کو اٹھا کر آنکھوں سے لگایا،پھر لبوں سے،پھر دل سے۔ ان کا دل کانپ رہا تھا۔پورا جسم کانپ رہا تھا۔سنبھالنے کی کوشش کے باوجود چینی کی وہ چکنی اور نازک پلیٹ ان کے ہاتھ سے پھسل کے زمین پر گری اور گرتے ہی ایک دل خراش آواز کے ساتھ چور چور ہو گئی۔ پلیٹ کے ٹوٹتے ہی ان کے لبوں سے ایک شگاف آواز نکلی۔!

''ہائے''

اور وہ جو اپنے شوہر کی میت پر آنسو نہ بہا سکی تھیں اس چینی کی

پلیٹ کے ٹکروں کو بٹورتے ہوئے بلک بلک کر رو رہی تھیں۔!''

(''وہ ایک نشانی تیری''، مشمولہ یہ میرا ظرف دیکھ، ص:12)

''مجھے نہ پکارو'' یہ افسانہ واحد متکلم کے انداز میں ہے۔ راوی جس کا نام ''پروین'' ہے، افسانے کا سب سے اہم کردار ہے۔ اس میں راوی اور اس کے بچپن کی دائی ''سلیمن بوا'' کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ بچپن میں 'بوا' اس کی دیکھ بھال کے لیے متعین کی گئی تھیں، لیکن اچانک جب اس کا بیٹا اسے واپس لے کر گیا تو سلیمن بوا کی زندگی ہی بدل گئی۔

ایک دن اچانک 'پروین' اور 'بوا' کا بس میں آمنا سامنا ہوا تو بوا نے اپنا چہرہ دوسری جانب کر لیا گویا وہ اسے پہچانتی ہی نہیں۔ راوی کا بچہ پیاس سے رو رہا تھا، سلیمن کے پاس پانی تھا مگر اس نے پوچھا بھی نہیں۔ اب وہ پوری طرح بدل چکی تھیں۔ اس کے جسم پر ہزاروں کے زیورات، مہنگے کپڑے اور ہاتھ میں ایک قیمتی پرس نظر آ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر پروین ماضی کی یادوں میں کھو گئی۔

راوی کا بیان ہے کہ جب وہ چھوٹی بچی تھی تو سلیمن بوا کو اس کی دیکھ بھال کے لیے متعین کیا گیا تھا۔ وہ ان کی پریشانی کا زمانہ تھا، شوہر سے علیحدگی کے بعد وہ اپنا پیٹ پالنے کے لیے گھر گھر کام کرنے پر مجبور تھی۔ شوہر نے طلاق کے بعد بچہ بھی چھین لیا تھا۔ شاید اسی لیے سلیمن بوا نے اپنی ساری ممتا ''پروین'' پر نچھاور کر دی تھی۔ پروین بھی ان کی دیوانی تھی ہمہ وقت وہ ان کے ساتھ رہتی یہاں تک کہ رات کو بھی ان ہی کے پاس سو جاتی۔ اسے نہلانا، دھلانا، کپڑے پہنانا جیسا سارا کام بوا ہی کرتی تھیں۔ یہ سلسلہ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے تک چلتا رہا۔ اس دن پروین کو زبردست دھچکا لگا جب بوا اسے چھوڑ کر چلی گئی اور رونا تو دور کی بات ہمدردی کے دو بول بھی اس نے نہیں کہے۔ اقتباس دیکھیں:

''مگر ایک دن ایک اکیس برس کا اونچا تندرست گہرا سلونا نوجوان، ہمارے دروازے پر آ کے کھڑا ہو گیا اور پکارا ''اماں'' وہ نوجوان اندر گھسا چلا آ رہا تھا، لہٰذا بڑے بھائی نے ڈپٹ کر کہا کون ہے؟

(''مجھے نہ پکارو''، مشمولہ یہ میرا ظرف دیکھ، ص:18)

اس طرح بے مروت سلیمن بوا ایک دم سے سب کچھ بھول گئیں اور ہمارے ساتھ گزارے ہوئے سولہ برس کو جھٹک کر ہماری زندگی سے ایک پل میں نکل گئیں۔ ان کا بیٹا 'کلوا' اب کلیم احمد کہلاتا تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد وہ بے پناہ دولت کا مالک بن گیا تھا۔ اس کے بعد اس نے اپنی ماں کے بارے میں معلومات حاصل کی اور اسے اپنے ہمراہ لے گیا۔ جانے کے وقت وہ رسماً پروین کے پاس گئی اور کہا: ''جا رہی ہوں بی بی، اللہ تم کو خوش رکھے۔''

''نوحہ غم ہی سہی'' میں میاں بیوی کے بڑھاپے اور ان کی لاچاری کو موضوع بنایا گیا ہے۔ جوان اولاد کی شادی کی فکر ماں باپ کو سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ مگر بعد میں وہی اولاد اپنے والدین کو بھول جاتی ہے۔ 'اختر' والدین کا اکلوتا بیٹا ہے لیکن برسر روزگار ہونے کے بعد وہ ماں باپ کے احسانات کو بھلا بیٹھتا ہے۔ اسے ان کی خدمت کا خیال نہیں رہا۔ ان لمحات میں والدین کے دلوں پر کیا گزرتی ہے اس کا عکس اس افسانے میں صاف نظر آتا ہے اور اسی کی ترجمانی عطیہ پروین نے کی ہے۔

''پچھلا دروازہ'' ازدواجی زندگی میں عورت کا بڑا اہم رول ہوتا ہے۔ محدود آمدنی میں عورت کس سلیقے سے ضروریات کو پورا کرتی ہے اسے صرف ایک خاتون ہی بہتر طور پر سمجھ سکتی ہے۔ عورت اپنے شوہر اور بچوں کے لیے جو قربانیاں دیتی ہے اس کا کوئی بدل نہیں ہے۔ اس کی محبت بے لوث ہوتی ہے۔ ایک عورت کن مسائل سے دوچار ہوتی ہے اس کی ترجمانی پچھلا دروازہ میں کی گئی ہے۔ بعض دفعہ بے وقت اور بغیر کسی اطلاع کے مہمانوں کا گھر پر آ جانا بھی ان کے لیے پریشان کن ثابت ہوتا ہے۔ اس سے گھر کے بجٹ کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ مثال ملاحظہ کریں:

''جانے کون آن مرا بے وقت! اس نے دانت پیس کر سوچا اور ایک طرف پڑی بھیگی ملگجی ساڑی پلیٹ لینے کے لیے بڑھی ٹائم پیس گیارہ بجا رہی تھی۔ روزانہ ٹھیک گیارہ بجے وہ فرصت پا چکتی تھی لیکن آج کچھ دیر ہو گئی تھی کپڑے زیادہ دھونے پڑ گئے تھے۔'' (''پچھلا دروازہ''، مشمولہ یہ میرا ظرف دیکھ، ص:48)

''جو ہم نے داستاں اپنی سنائی'' یہ افسانہ شاہدہ اور فاخرہ نامی دو سہیلیوں کی گفت و شنید پر مشتمل ہے۔ شاہدہ فاخرہ کو اپنے گھریلو حالات بتا رہی ہے اور اپنے شوہر کی تعریفیں کر رہی ہے۔ افسانہ نہایت دلچسپی کے ساتھ آگے بڑھتا ہے، جیسے جیسے شاہدہ اپنے شوہر کی تعریفیں کرتی جاتی ہے، فاخرہ کے چہرے کا رنگ زرد پڑتا جاتا ہے۔ افسانے میں شاہدہ کے شوہر کا کردار کمزور ہے۔ کہانی پڑھنے سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ دراصل شادی سے قبل شاہدہ کے شوہر کا تعلق فاخرہ سے تھا۔ لہٰذا وہ جہاں ایک بہترین شوہر ثابت ہوتا ہے وہیں دوسری جانب فاخرہ کی نظر میں وہ ایک برا انسان اور بے وفا محبوب ہے۔ جس نے فاخرہ جیسی لڑکی کی زندگی میں زہر گھول دیا تھا۔ افسانے کا یہ اقتباس دیکھیں:

''فاخرہ۔فاخرہ۔کیوں کیا ہوا تمہیں۔تمہاری ہنستی کھیلتی زندگی میں زہر گھول کر مجھے کچھ نہیں ملے گا۔خدا کرے تمہارا بچہ دنیا بھر کی خوشیاں سمیٹے میرے اس بچے کی طرح دنیا میں آنے سے پہلے نالی میں نہ بہادیا جائے۔''

''فاخرہ''

''اپنے نیک اور محبت کرنے والے فرشتہ خصلت شوہر سے یہ کبھی نہ کہنا شاہدہ کہ ایک پگلی سی لڑکی ان کی دہلیز پر آئی تھی۔''

''فاخرہ۔فاخرہ۔رکو تو سہی۔سنو تو سہی!اف اللہ یہ سب کیا ہے۔''

(''جو ہم نے داستاں اپنی سنائی''مشمولہ یہ میرا ظرف دیکھ،ص:84)

''**یہ میرا ظرف دیکھ**'' یہ افسانہ عورت کے ایثار اور قربانی کی داستان ہے۔ چوں کہ انسانی زندگی میں بعض ایسے بھی لمحات آتے ہیں جب دوسرے کی خوشی کے لیے اپنی خوشی قربان کردی جاتی ہے۔اس کام میں مرد کے مقابلے عورتیں زیادہ ثابت قدم رہی ہیں۔ مذکورہ افسانے میں ایک نواب اور ان کی دو بیگمات کی کہانی پیش کی گئی ہے۔ بڑی بیگم لا ولد ہے، چھوٹی بیگم کا ایک بیٹا ہے جو'چھوٹے نواب' کے نام سے مشہور ہے۔اس کی پرورش بڑی بیگم کررہی ہیں۔اس طرح دونوں بیگموں کی محبت اس کو حاصل ہے۔کہانی میں ایک ایسا موڑ بھی آتا ہے جب انجانے میں چھوٹا نواب اپنی ہی ماں کو طوائف کہہ دیتا ہے۔

عطیہ پروین کے افسانوں کے مطالعہ کے بعد یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ان کی کہانیوں کا موضوع صرف 'عورت' ہے، ان میں وہ ماں، بیوی، بہن، بیٹی جیسے تمام کرداروں کے روپ میں نظر آتی ہے۔ وہ زیادہ تر خاندانی رسم ورواج کی باتیں کرتی ہیں۔ ان کی کہانیاں بالکل پاک و صاف اور مشرقی معاشرے کی پروردہ ہیں، کسی بھی کہانی میں فحاشی اور عریانی نظر نہیں آتی۔ وہ اپنی کہانیوں کو بازار و اور پیشہ ور عورتوں کے ذکر سے بھی حتی الامکان دور ہی رکھتی ہیں۔ وہ عشق و عاشقی کی باتیں بھی نہیں کرتیں۔ انھوں نے نسوانی معاشرے کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے، اسی سے وہ اپنی کہانیوں کو بنتی ہیں اور یہی ان کی کہانیوں کا اصل مرکز ہے۔ گھریلو زندگی میں پیش آنے والے واقعات وحادثات پر ان کا قلم بڑی تیز رفتاری کے ساتھ چلتا ہے۔ان کی کہانیوں میں کوئی نہ کوئی مقصد ضرور پوشیدہ ہوتا ہے۔ ان کے افسانوں میں ذاتی مشاہدات و تجربات کا اثر صاف طور پر نظر آتا ہے۔ان کے شائع شدہ افسانوں کی کثرت کا ذکر ماقبل میں کیا جاچکا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کے تمام افسانے شائع ہو کر منظر عام پر آئیں۔ تاکہ اردو ادب کے عام قارئین بھی ان کی خدمات سے پوری طرح آگاہ ہوسکیں۔

□□□

Dr. Zafrul Islam
Vill- Karimuddinpur
Post Ghosi
Distt. Mau-275304 (U.P)
Mob: 9336239933

اردو صحافت کا آغاز و ارتقا

ڈاکٹر سمیہ تمکین

انسان ایک سماجی حیوان ہے۔ یہ اس کی فطرت میں شامل ہے کہ وہ سماج میں ہونے والی تبدیلیوں سے باخبر رہے۔ انسان کی اس فطرت کی تکمیل مختلف علاقوں سے اس تک خبروں کی رسائی کے ذریعہ ہوتی ہے۔ خبروں کی رسائی کے کام کو صحافت کہتے ہیں۔ صحافت کا کام دنیا بھر کے لوگوں تک خبروں کی ترسیل ہے۔ دور حاظر میں صحافت کو ایک خصوصی فن کی حیثیت حاصل ہے۔ صحافت سماجی سرگرمی کا ایک بہت بڑا حصہ ہے۔ اسی تناظر میں، ہم یہاں صحافت کے لغوی اور اصطلاحی معنی دیکھیں گے۔

'صحافت' عربی زبان کا لفظ ہے جو صحیفہ سے لیا گیا ہے جس کے لغوی معنی ''مطبوعہ صفحہ'' کے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید لکھتے ہیں:

''صحافت کا لفظ صحیفہ سے نکلا ہے اور صحیفہ کے لغوی معنی کتاب یا رسالے کے ہیں۔ بہر حال عملاً ایک عرصہ دراز سے صحیفہ سے مراد ایک ایسا مطبوعہ مواد ہے جو مقررہ وقتوں میں شائع ہوتا ہے۔ صحافت کا مترادف انگریزی لفظ جرنلزم (Journalism) ہے جو ''جرنل'' سے بنایا گیا ہے۔ جرنل کے لغوی معنی ''روزانہ حساب کا بہی کھاتہ'' روزنامچہ۔ جرنل کو ترتیب دینے والوں کے لیے جرنلسٹ کا لفظ بنا اور اس کو جرنلزم کا نام دیا گیا۔''

(بحوالہ۔ ڈاکٹر افضل مصباحی۔ اردو صحافت آزادی کے بعد۔ ص 29)

صحافت بنیادی طور پر اخبار نویسی اور رسالہ نگاری کے عمل کا نام ہے۔ تازہ خبریں اور حالات حاضرہ پر مختلف قسم کے مضامین جمع کر کے انھیں ایک وقفہ کے تحت شائع کرنا' صحافت کہلاتا ہے۔ صحافت کو مملکت کا چوتھا ستون بھی کہا جاتا ہے۔ جس طرح کسی بھی مملکت میں عدلیہ' عاملہ اور مقننہ عوامی مفادات کے لیے کام کرتے ہیں اسی طرح صحافت بھی ملک کی عوام کے مفادات کا تحفظ کرتی ہے۔ یہ جمہوری نظام کی کامیابی میں ایک اہم رول ادا کرتی ہے۔

اردو صحافت نے ایک پرآشوب دور میں آنکھ کھولی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط تھا اور عوام کی بنیادی آزادی چھین لی گئی تھی ایسے مشکل وقت میں جابر حکمران کے سامنے سچ بات کہنے کا ذمہ سب سے پہلے اردو صحافت نے قبول کیا۔

ہندوستان کی علمی' ادبی' اور فنی تاریخ کا مطالعہ کریں تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ ان تمام علوم وفنون کی ترویج و اشاعت میں صحافت کا اہم رول رہا ہے۔ ہمیں یہ بھی اندازہ ہوگا کہ ابتدائی ایام میں اخبارات کس طرح نکلتے تھے اور کون سے اخبارات منظر عام پر آئے۔ ہندوستان کی صحافتی تاریخ بہت قدیم ہے۔ ان تمام کا احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ تاہم ان چند اخبارات کا ذکر اہمیت کا حامل ہے جو ابتدائی مراحل میں اور بعد کے مرحلوں میں صحافتی خدمات انجام دیتے رہے۔

اردو صحافت کا آغاز ایک بہت بڑے مقصد کے تحت وجود میں آیا۔ اسی لیے اپنے آغاز سے دو سو سال بعد بھی اس میں مقصدیت اور

جرأت اظہار دوسروں سے کئی گنا زیادہ پایا جاتا ہے۔ دیگر زبانوں کے مقابلے میں اردو صحافت کو ایک خاص مقام حاصل ہے کیونکہ یہ اخبارات ملک وقوم کے تئیں ذمہ داری کا جذبہ رکھتے ہیں اور انھوں نے یہ باور کرایا کہ مادی نقصانات کی قیمت پر بھی وہ کبھی اپنے مشن سے دستبردار نہیں ہوں گے۔ اسی لیے آج بھی اردو کے ایسے دسیوں اخبارات نکل رہے ہیں جو سراسر گھاٹے کا سودا ہے مگر انہوں نے حالات کے آگے کبھی اپنے سر کو جھکنے نہیں دیا۔ بقول امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد:

''ہم اس بازار میں سودائے نفع کے لیے نہیں بلکہ تلاش زیاں ونقصان میں آئے ہیں۔ صلہ اور تحسین کے نہیں بلکہ نفرت و دشنام کے طلب گار ہیں۔ عیش کے پھول نہیں بلکہ خلش و اضطراب کے کانٹے ڈھونڈتے ہیں۔''

(بحوالہ۔ معصوم مرادآبادی۔ اردو صحافت کا آغاز۔ ص18)

پہلا پریس کمیشن آزادی کے 5 سال بعد 1952 میں وجود میں لایا گیا۔ جس نے فوری طور پر (RNI) رجسٹرار آف نیوز پیپرس آف انڈیا کے قیام کی پرزور وکالت کی تاکہ اخبارات کے سرکیولیشن اور اعداد و شمار کی رپورٹ ہر سال وزارت اطلاعات ونشریات کو پیش کی جاسکے۔ RNI کی پہلی رپورٹ 1958 میں منظر عام پر آئی جس میں 1957 کے اعداد و شمار شامل کیے گئے تھے۔

ہندوستان میں مطبوعہ صحافت کا آغاز انگریزی کے ایک اخبار ''ہکیز گزٹ'' سے ہوا۔ یہ اخبار 1780 میں کلکتہ سے جاری ہوا۔ اس اخبار کا اصل نام ''ہکیز بنگال گزٹ'' یا ''کلکتہ جنرل ایڈورٹائزر'' تھا۔ لیکن عام طور پر بنگال گزٹ یا مالک وایڈیٹر کے نام کی مناسبت سے یہ اخبار ''ہکیز گزٹ'' کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اس اخبار کے ایڈیٹر کا نام جس میں اگٹس ہکی تھا انھوں نے اپنا پہلا شمارہ 29 رجنوری 1780 کو شائع کیا۔ یہ 6 صفحوں کا ایک چھوٹا سا اخبار تھا جس میں قرب وجوار کے نامہ نگار اپنی مکتوبات شائع کیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی یوروپ سے آئی ہوئی خبروں کا خلاصہ بھی اس اخبار میں دیا جاتا تھا۔ بقول معصوم مرادآبادی:

''اس اخبار کی ایک ناقص فائل برٹش میوزیم لندن اور نیشنل لائبریری کلکتہ میں محفوظ ہے۔''

(بحوالہ۔ ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں۔ ص64۔109)

ایک اور جگہ سید اقبال احمد قادری لکھتے ہیں:

''ہندوستان کا سب سے پہلا اخبار کلکتہ سے شنبہ 29 رجنوری 1780 کو شائع ہوا۔ ہکیز بنگال گزٹ (Hicky's Bengal gazette) اس ہفت روزہ کا نام تھا۔ اس کے مدیر، طابع، ناشر اور مالک کا نام جس میں (Hicky James Augustas) تھا جو کچھ دنوں ایسٹ انڈیا کمپنی سے بحیثیت طابع وابستہ تھا۔ اس انگریزی اخبار کے صرف دو ورق تھے جس میں کئی اشتہارات ہوتے تھے''۔

(بحوالہ ڈاکٹر افضل مصباحی۔ اردو صحافت آزادی کے بعد۔ ص26)

یوں تو اردو صحافت کا آغاز 1822 میں کلکتہ سے ''جام جہاں نما'' کی اشاعت سے عمل میں آیا۔ لیکن اس کا اصل بانکپن 1837 میں دہلی اردو اخبار، مولانا آزاد کے والد مولانا محمد باقر نے دہلی سے جاری کیا تھا۔ 1857 میں ہونے والے واقعات کی بے باکانہ رپورٹنگ اور اس دور کے واقعات کو صحیح تناظر میں لوگوں تک پہنچانے کی پاداش میں اس اخبار کے ایڈیٹر پر انگریزوں کا عتاب نازل ہوا اور مولوی محمد باقر کو انگریزوں نے گرفتار کرکے سفاکی سے شہید کردیا۔ ہندوستان کی آزادی کی لڑائی میں کسی بھی زبان کی صحافت کی طرف سے پیش کی جانے والی یہ پہلی قربانی تھی۔

جنگ آزادی کے دوران بہت سے اخباروں نے اس مہم میں حصہ لیا۔ صحافیوں اور ان سے مربوط اخبارات کے خلاف مقدمات بھی چلائے گئے۔ مگر ان صحافیوں نے اپنے فرائض کی انجام دہی میں ذرہ برابر بھی کسر نہیں چھوڑی اور اپنے مشن میں کامیاب بھی ہوئے۔ 1857 کی جنگ آزادی کے دروان دہلی میں اردو کے تین اخباروں نے اہم کردار ادا کیا۔ ان میں مولوی محمد باقر کا ''دہلی اردو اخبار''، جمیل الدین ہجر کا ''صادق الاخبار'' اور مرزا بیدار بخت کا ''پیام آزادی'' شامل ہے۔

ان تینوں اخبارات نے 1857 میں آزادی کی شمع کو روشن کرنے میں ایک گرانقدر کارنامہ انجام دیا۔ 1857 کی جنگ آزادی کے دوران سب سے زیادہ اہم کردار ادا کرنے والا اخبار دہلی اردو اخبار ہے۔

جنگ آزادی کے انقلاب کا آغاز 10 رمئی کو میرٹھ میں موجود سپاہیوں کی بغاوت سے ہوا۔ 11 رمئی کو یہ سپاہی دہلی پہنچے جس کے بعد دہلی شور وہنگامے کی زد میں آگئی۔ 17 رمئی کو ہفتہ وار ''دہلی اردو اخبار'' کا شمارہ منظر عام پر آیا تو اس کے صفحات انقلاب کی خبروں سے لبریز تھے چونکہ یہ اخبار ایک حد تک متوازن اور احتیاط سے پر تھا مگر انقلاب کی فضاء کے زیر اثر یہ اخبار کا توازن اور احتیاط سب رخصت ہوگئی اور یہ ایک مکمل طور پر بدلا ہوا اخبار بن گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اچانک پیدا ہونے والے اس انقلاب نے مولوی محمد باقر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ انھیں اس بات کا یقین کرنا مشکل نظر آرہا تھا کہ انقلاب برپا کیسے ہوسکتا ہے اور وہ فرنگی جو عملی طور پر

ہندوستان کے سیاہ وسفید کے مالک ہو گئے تھے وہ اتنے بے بس اور مجبور کیسے ہوسکتے ہیں کہ مشکل اور بچھڑے ہوئے ہندوستانیوں کے ہاتھوں کیفر کردار تک پہنچ رہے تھے۔

دہلی اردو اخبار کا دوسرا شمارہ جب 24 رمئی کو منظر عام پر آیا تو اس میں ہندوستان کے کئی اور مقامات اور دہلی کے غدر کے حالات پیش کیے گئے تھے۔ جن میں کول' بلند شہر، کانپور، لکھنؤ، آگرہ، سکندرہ آباد، غازی آباد، بلب گڑھ، میرٹھ، روہتک اور کرنال شامل ہیں۔

پہلی جنگ آزادی کی شخصی رپورٹنگ بے باک انداز میں مولوی محمد باقر نے انجام دی۔ ان کے ایسے کارناموں سے خوش ہوکر بہادر شاہ ظفر نے اپنے نام کی مشابہت سے ان کے اخبار کا نام ''اخبار الظفر'' رکھ دیا۔ جس کا اعلان 12 جولائی 1857 کے شمارے میں سرورق پر ہوا اور آخر میں دس شمارے اسی نام سے شائع ہوئے۔ دہلی اردو اخبار کے غیر معمولی کردار کے بارے میں مولانا امداد صابری یوں لکھتے ہیں:

''دہلی میں جب تک جنگ جاری رہی اس وقت تک دہلی اردو اخبار نے نہ صرف اپنے صفحات آزادی کو کامیاب کرنے کے لیے وقف کر رکھے تھے بلکہ اس کے بانی مولوی محمد باقر نے کلم کے جنگ کے علاوہ تلوار سے بھی انگریزوں سے جنگ لڑی اور جس وقت جنگ ناکام ہوئی اور انگریز دہلی پر قابض ہو گئے تو اخبار ہند ہونے کے ساتھ ساتھ مولانا محمد باقر انگریزوں کی گولی کا نشانہ بنے اور جام شہادت نوش کیا۔''

(بحوالہ: امداد صابری، روح صحافت 261_260)

غرض مولوی محمد باقر نے 16 رستمبر 1857 کو دہلی میں شہیدی کا جام نوش فرمایا اور ملک کے لیے ملک کی آزادی کی خاطر اپنی جان قربان کرنے والے ہندوستان کے پہلے صحافی کے طور پر تاریخ میں اپنا نام سنہرے حرفوں میں درج کرایا۔

جدوجہد آزادی میں '' دہلی اردو اخبار'' کے بعد جس اخبار نے نمایاں رول ادا کیا وہ سید جمیل الدین ہجر کا ''صادق الاخبار'' ہے۔ اس اخبار کو 1857 کی پہلی جنگ آزادی کے حوالے سے کافی شہرت ملی کیونکہ یہ اخبار انقلاب کی ناکامی کے بعد اس مقدمہ میں زیر بحث آیا جو انگریزوں نے قائد انقلاب بہادر شاہ ظفر پر قائم کیا تھا۔

سید جمیل الدین ہجر نے ''صادق الاخبار'' میں علمائے کرام کا وہ فتوی بھی نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کیا جس میں انگریزوں کے خلاف انقلابیوں کی جنگ کو عین جہاد قرار دیا گیا۔ ''صادق الاخبار'' کے بارے میں عتیق احمد صدیقی یوں لکھتے ہیں:

''دہلی کا سب سے قابل ذکر اخبار ''صادق الاخبار'' ہے جس نے بغاوت کے جذبات کی تخم ریزی میں سب سے زیادہ حصہ لیا اور جس نے بغاوت کے دوران باغیوں کے جذبات واحساسات کی ترجمانی بھی کی تھی۔''

(بحوالہ: عتیق احمد صدیقی ہندوستانی اخبار نویسی۔ص 264_263)

تحریک آزادی میں جان ڈالنے کے لیے اور ہندو مسلم اتحاد برقرار رکھتے ہوئے دونوں کو ایک پرچم تلے جمع کرنے کے سلسلے میں ''پیام آزادی'' کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ بہادر شاہ ظفر کے نواسے مرزا بیدار بخت کے حکم سے اس اخبار کی اشاعت فروری 1857 میں عمل میں آئی۔

اردو صحافت کے ارتقاد میں جن اخبارات نے چار چاند لگا دئے ان میں سے چند ایک کا ذکر بے جا نہ ہوگا۔ یہ وہ اخبارات ہیں جو مختلف ادوار میں شائع ہوئے ہیں۔ صحافت کی ترقی میں یا اس کے ارتقاء میں ان اخبارات و جرائد کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ''جام جہاں نما'' 1822 سے لے کر حصول آزادی 1947 تک اردو کے بے شمار اخبارات، جرائد، ہفتہ وار روزنامے اور ماہنامے جاری ہوئے ہیں۔ یہ اخبارات ایسے ہیں جن کے ذکر کے بغیر اردو صحافت کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔

سید الاخبار:

سید الاخبار دراصل دوسرا ہفت روزہ اخبار تھا جو دہلی اردو اخبار کے اجراء کے بعد 1837 میں جاری ہوا۔ سید الاخبار کے ایڈیٹر مولوی عبدالغفور جو ایک قانون دان تھے جس کی وجہ سے اس اخبار کی مقبولیت وکلاء میں زیادہ ہوئی۔ اس اخبار کے اصل مالک سر سید احمد خان کے بھائی سید محمد خان تھے جو منصف کے عہدے پر فائز تھے۔ 1846ء میں سید احمد خان کے انتقال کر جانے کے بعد اس اخبار کی ذمہ داری سر سید احمد خان نے سنبھالی اور اس میں متعدد مضامین بھی لکھے۔ دیوان غالب کا پہلا ایڈیشن اسی اخبار کے پریس میں طبع ہوا۔ 1850 میں اس اخبار کی اشاعت کو بند کردیا گیا۔

کوہ نور:

اردو کی مطبوعہ صحافت کے ابتدائی دور کے اخبارات میں کوہ نور بھی ایک اہم اخبار کی صورت میں قارئین کے سامنے آیا۔ یہ اخبار لاہور سے 14 رمئی 1850 کو جاری ہوا۔ اس کے مالک منشی ہرسکھ رائے ایک ذی علم کائستھ گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور انگریزوں کے وفادار تھے۔ اردو صحافت کے فروغ میں کوہ نور کا کردار تاریخی نوعیت کا حامل ہے۔ اس نے

نصف صدی تک اپنے قدم جمائے رکھے اور اردو سے جید صحافیوں کی کہکشاں اسی اخبار سے پروان چڑھی لیکن اس کے باجود یہ اخبار اپنی سامراج مزاجی کے سبب ایک مثبت مقام پیدا نہ کرسکا۔اس اخبار کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی سرپرستی حاصل تھی اور یہ اخبار اپنے دور کا کثیر الاشاعت اخبار تھا۔منشی پرسکھ رائے نے پہلے اسے ہفت روزہ رکھا پھر سہ روزہ کیا پھر دو روزہ اور 1888 میں روزنامہ بنادیا لیکن ان کا یہ تجربہ ناکام رہا۔اردو میں اس اخبار کی ترقی کو دیکھتے ہوئے منشی پرسکھ رائے نے اسے انگریزی میں بھی شائع کرنے کی کوشش کی لیکن یہ کوشش ان کی کامیاب نہ ہوسکی اور 1904 میں یہ اخبار بند ہوگیا۔کوہ نور ایک معیاری اخبار تھا اس میں صوبائی خبروں کے ساتھ ساتھ غیر ملکی خبروں کو بھی شائع کیا جاتا تھا اور سیاست، تاریخ، جغرافیہ، مذہبی، مشاعرہ اور قانون کے موضوعات پر بھی مضامین اہم اخبار میں شائع ہوتے تھے۔

اردو زبان کا پہلا رسالہ: خیر خواہ ہند:۔

اردو زبان میں سب سے پہلا رسالہ ''خیر خواہ ہند'' کے نام سے 1837 میں مرزاپور (بنارس) سے جاری ہوا۔اس کے ایڈیٹر آر سی ماتھر تھے۔ یہ اخبار بیک وقت فارسی اور رومن رسم الخط میں شائع ہوتا تھا۔اس کے علاوہ اردو میں علمی وادبی رسائل دہلی اور لاہور کے علاوہ آگرہ سے کثیر تعداد میں شائع ہونے لگے۔دہلی اور آگرہ سے کالجوں کی نگرانی میں رسائل شائع ہوتے رہے جب کہ لاہور میں رسائل کی اشاعت کا کام نجی طور پر ہوا تاہم اس میں حکومت کا تعاون بھی شامل تھا۔

اعظم الاخبار:

مدراس سے نکلنے والا ایک اہم اخبار تھا جس کا اجرا 1848 میں عمل میں آیا۔ اس دور کے نواب غلام غوث خان بہادر المتخلص بہ اعظم کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اس اخبار کا نام ان کی مماثلت سے رکھا گیا اور اس نسبت سے نواب غلام غوث خان کے سرکاری نشان بھی اخبار کی لوح پر شائع کیا جاتا تھا۔ یہ اخبار 8 تا 10 صفحات پر مشتمل تھا اور اس کا مطبع ترمل کھیڑی (موجودہ ٹرپلی کین) میں واقع تھا۔اعظم الاخبار مسلمانوں کی تعلیمی ومعاشی ترقی کا علمبردار تھا۔اس اخبار کی ماہانہ قیمت ایک روپیہ اور سالانہ قیمت 10 روپیہ تھی۔

اودھ اخبار:

اودھ اخبار 1858 میں لکھنؤ سے جاری ہوا۔اس کے مالک منشی نول کشور تھے۔اودھ اخبار کو غیر معمولی اہمیت حاصل رہی۔ 1871 میں اس اخبار کو منشی نول کشور نے سہ روزہ بنادیا جس سے اس کی وقعت میں کافی اضافہ ہوا۔سرسید کے مشورہ پر بعد میں اسے روزنامہ کی شکل دے دی گئی۔ اس اخبار کی پالیسی اعتدال پر مبنی تھی۔اس کا کوئی سیاسی مسلک نہیں تھا۔ تنازعات سے پاک تھا لیکن اس کا نقطہ نظر غیر فرقہ وارانہ ہوا کرتا تھا۔اردو اخبار کو فروغ دینے میں ایڈیٹر منشی غلام محمد خان تپش کی صلاحیتوں کا بڑا دخل تھا۔تپش کے بعد پنڈت رتن ناتھ سرشار نے اس اخبار کی ادارت سنبھالی اور اپنی تصنیف ''فسانۂ آزاد'' کو اسی اخبار میں بطور ضمیمہ شائع کی۔جس کی وجہ سے اخبار کی ہر دل عزیزی اور ساتھ ہی ساتھ سرشار کی مقبولیت میں بے پناہ اضافہ ہوا۔اودھ اخبار ہر طرح سے ایک مکمل اخبار تھا۔اس میں تازہ خبریں، تبصرے اور مضامین شائع ہوتے تھے۔ ادارے کے ساتھ ساتھ سیاسی وغیر سیاسی مضامین کے علاوہ معاشرتی مضامین بھی اس اخبار میں شائع کیے جاتے تھے۔یہ اخبار معاشرے کا علمبردار اور معاشرے کی اصلاح کا حامی تھا۔

طنز وظرافت سے بڑے بڑے اصلاحی اور معاشرتی کام لیے جاتے ہیں۔کسی بات کو کہنے کے مختلف طریقے ہوتے ہیں ان میں سے کسی موثر طریقہ کے استعمال سے کوئی کام نکل جائے یا کوئی بڑی شئے وجود میں آجائے تو اس طریقے کا استعمال ہنر بن جاتا ہے۔اسی طرح طنز وظرافت بھی ہے۔اس کے ذریعہ بڑے بڑے مشکل کام آسان ہوجاتے ہیں اور لفظوں کی الٹ پھیر سے بہت سی تبدیلیاں واقع ہوجاتی ہیں۔اردو صحافت میں بھی طنز ومزاح سے کام لیا جاتا ہے۔مختلف اخبارات جو طنز ومزاح کے حوالے سے جانے جاتے ہیں ان میں اودھ پنچ لکھنؤ، سرپنچ ہند، دہلی پنچ دہلی وغیرہ اخبارات طنز ومزاح سے مربوط صحافت کا حصہ ہیں۔ان ظرافتی اخبارات نے اردو ادب میں بالخصوص ہندوستانی معاشرے کی بہتر تشکیل میں نمایاں کردار ادا کیے ہیں۔

اودھ پنچ:

اردو میں مزاحیہ صحافت کی دنیا میں ''اودھ پنچ'' کو سب سے بڑا اخبار مانا جاتا تھا۔اس کے ایڈیٹر منشی سجاد حسین تھے اور انھوں نے یہ اخبار جنوری 1877 کو لکھنؤ سے شائع کیا۔اس اخبار کو معروف ادیبوں اور طنز ومزاح نگاروں کا مکمل تعاون حاصل تھا۔ان میں پنڈت رتن ناتھ سرشار، پنڈت تربھوناتھ ہجر، منشی جوالا پرساد برق، مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، منشی احمد علی شوق اور احمد علی کسمنڈوی کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ''اودھ پنچ'' ظرافت کا سرچشمہ تھا اور یہ ہندوستان کا پہلا مزاحیہ اردو اخبار تھا جس نے اپنے عہد کے انقلابی تبدیلیوں کے خلاف ردعمل کا اظہار کیا۔ اودھ پنچ اخبار تقریباً 36 سال تک نکلتا رہا۔اس دوران اس میں بہت سی

تبدیلیاں رونما ہوئیں لیکن اس کا مزاج نہیں بدلا۔ بظاہر اودھ پنچ ایک مزاحیہ اخبار تھا لیکن اس مزاح کی آڑ میں یہ اخبار اس دور میں ہونے والے سیاسی، سماجی، تہذیبی اور ثقافتی مسائل کو بخوبی پیش کرتا تھا۔ اس اخبار کا خاص مقصد مغربی تہذیب اور سرسید کی مخالفت، حکومت پر جرأت مندانہ تنقید اور لکھنوی زبان وادب کا فروغ وتحفظ تھا۔

سرپنچ ہند:

سرپنچ ہند اخبار ستمبر 1877 کو لکھنؤ سے جاری ہوا۔ یہ بھی ظریفانہ موضوعات پر مشتمل اخبار تھا جو ہفت روزہ کی شکل میں شائع ہوا۔ اس اخبار کے مالک اور ایڈیٹر امبیکا پرساد تھے۔

یہ اخبار اپنے عہد کے سیاسی مسائل پر بھی اپنے مخصوص ظریفانہ لب ولہجے میں تبصرے کیا کرتا تھا۔ اس کے ادارتی مضامین دلچسپ اور بصیرت افروز ہوا کرتے تھے۔ ان میں نہ صرف اخلاقی اور تہذیبی بحث کی جاتی تھی بلکہ سیاسی اور معاشرتی مسائل اور بین الاقوامی صورت حال کو بھی موضوع بنایا جاتا تھا۔ سرپنچ ہند سنجیدہ اور غیر سنجیدہ خبروں میں بھی اپنے ظریفانہ اسلوب کو برقرار رکھتا تھا۔

''دہلی پنچ''

''دہلی پنچ' یکم جنوری 1880 کو دہلی سے جاری ہوا لیکن اس کے فوری بعد یہ اخبار لاہور منتقل ہو گیا۔ اس کے مالک منشی حسین علی فرحت دہلوی تھے۔ اس اخبار کا سالانہ چندہ دس روپے تھا۔ اس کے ایڈیٹر منشی اللہ دین تھے۔ دہلی پنچ ایک جرات مند اور بے باک پالیسی کا حامل اخبار تھا۔ یہ اخبار بھی دیگر ظریفانہ اخباروں کی طرح انگریزوں کی مخالفت میں مضامین شائع کرتا تھا۔

سائنٹفک سوسائٹی اخبار:

سائنٹفک سوسائٹی کی داغ بیل سرسید احمد خان نے 9 /جنوری 1864 کو غازی پور میں ڈالی تھی۔ بعد میں اس کے دفتر کی منتقلی علی گڑھ میں ہوئی۔ اس سوسائٹی کے زیر اہتمام ''سائنٹک سوسائٹی اخبار'' کے نام سے 3 مارچ 1866 کو ایک اخبار جاری ہوا۔ اس کو ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ آف گزٹ'' کے نام سے جانا جاتا تھا۔ شروع شروع میں یہ اخبار ہفت روزہ تھا بعد میں سہ روزہ ہو گیا اور سرسید کی وفات کے بعد بھی یہ اخبار شائع ہوتا رہا۔ اس اخبار کی خاصیت یہ تھی کہ اس کا ایک کالم انگریزی اور ایک کالم اردو میں شائع ہوتا تھا۔ بعض مضامین اردو اور انگریزی میں الگ الگ ہوتے تھے۔ یہ اخبار ایک سیاسی، علمی، اخلاقی اور معاشرتی اخبار تھا جس کا خاص مقصد انگریز حکمرانوں اور رعایا میں صلح ومفاہمت کی فضاء کو پروان چڑھانا تھا۔ دولسانی اخبار ہونے کی وجہ سے انگریز بھی اس کا مطالعہ کرتے تھے۔ اس اخبار کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ ٹائپ کی طباعت تھی۔ اس دور کے اخبارات لیتھو پر چھپتے تھے۔ سرسید نے اس کے لیے موٹے اور روشن ٹائپ کا استعمال کیا جو اردو صحافت کے لیے ایک جدت تھی۔ اخبار کے لے آؤٹ میں بھی سادگی اور نفاست پائی جاتی تھی۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ہر طرح کی خبریں جیسے قومی، بین الاقوامی، سیاسی اور سماجی خبروں وغیرہ کی اشاعت کی جاتی تھی لیکن چونکہ سرسید تعلیم کو زیادہ ترجیح دیتے تھے لہٰذا اس میں تعلیمی خبروں کو اہمیت دی جاتی تھی۔

تہذیب الاخلاق:

اردو صحافت کے فروغ میں سرسید احمد خان کا دوسرا اہم کارنامہ تہذیب الاخلاق کا اجراء ہے۔ تہذیب الاخلاق کو سرسید کا سب سے بڑا صحافتی کارنامہ تصور کیا جاتا ہے۔ اس کا پہلا شمارہ 24/دسمبر 1870 کو شائع ہوا۔ انگریزی میں اس کا نام ''ڈی محمڈن سوشل ریفارمر'' تھا۔ یہ اخبار نسخ ٹائپ میں اعلی درجہ کے دبیز کاغذ پر شائع ہوتا تھا۔ ہر صفحہ پر دو کالم ہوتے تھے۔ 8 تا 12 صفحات پر شائع ہوتا تھا اور قیمت فی شمارہ چار آنے کی تھی۔ یہ ہر ماہ تین مرتبہ شائع ہوتا تھا اور مسلسل چھ سال سات ماہ تک جاری رہا۔ اس اخبار کا اہم مقصد برصغیر کے مسلمانوں کی ہمہ جہتی اصلاح تھا۔ اس اخبار نے مسلمانوں کی زندگیوں میں انقلاب برپا کر دیا۔ اس اخبار کو سرسید نے صرف خبر رسانی کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ معاشرے کی اصلاح کا وسیلہ بنایا۔

پیسہ اخبار:

''پیسہ اخبار'' جنوری 1887 میں مالک مولوی محبوب عالم فیروز والا سے جاری کیا۔ بعد میں اسے لاہور منتقل کیا۔ ابتداء میں یہ اخبار چھوٹی تقطیع کے آٹھ صفحات پر ہفتہ میں ایک بار شائع ہوتا تھا۔ اس اخبار نے اردو صحافت میں مقبولیت کا نیا سنگ میل قائم کیا۔ یہ اخبار اردو صحافیوں کے لیے ایک تربیت گاہ ثابت ہوا۔ جن میں منشی احمد دین فوق، مولانا عبدالمجید سالک اور جالب دہلوی کے نام قابل ذکر ہیں۔ یہ ایک سیکولر اخبار تھا جس میں مسلمانوں کے حقوق کی ترجمانی کی جاتی تھی۔ اس اخبار نے صحافت میں تجارت کے اصولوں کی بنیاد رکھی۔ اس کی قیمت کم تھی لیکن اس کی تلافی اشتہارات کی کثرت سے کی جاتی تھی جو اس زمانے کے دیگر اخباروں کو میسر نہیں تھی۔

اردوئے معلیٰ:

اردوئے معلیٰ 1903ء میں علی گڑھ سے جاری کیا گیا جس کے

مالک اور مدیر اردو کے مشہور شاعر مولانا حسرت موہانی تھے۔ یہ اس دور کا واحد ماہانہ رسالہ تھا جس میں علم و ادب کے ساتھ ساتھ سیاسی مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ جس وقت اس رسالہ کا اجراء ہوا اس وقت اردو صحافت کا عام مزاج اعتدال پسند تھا۔ مولانا حسرت موہانی کامل آزادی کے خواہش مند تھے۔ اردوئے معلّٰی میں انگریزوں کے خلاف باغیانہ خیالات کو شائع کرنے کے ضمن میں انھیں جیل کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑیں جس کی وجہ سے انگریز سامراج کے خلاف ان کے خیالات میں مزید پختگی آ گئی۔ حسرت موہانی ایک مضبوط سیاسی ذہن کے مالک تھے۔ انھیں سر سید کی انگریز دوستی سے اختلاف تھا۔ آپ ملک سے بے لوث محبت کرتے تھے ان کا مطمح نظر اپنے رسالہ سے کبھی بھی پیسہ کمانا نہیں تھا۔ صحافت میں اعلیٰ مقصد کے حامی تھے۔ حسرت موہانی کا نام اردو صحافت کے معماروں میں جلی حرفوں میں لکھا جاتا ہے۔

زمیندار:

مولانا ظفر علی خان کے والد مولانا سراج الدین احمد نے جون 1903 میں ہفت روزہ اخبار ''زمیندار'' جاری کیا۔ اس اخبار کی اشاعت کا مقصد زمینداروں، کاشتکاروں اور کسانوں کی بھلائی کا کام کرنا تھا۔ مالی مشکلات کے سبب اس اخبار کا چلنا دوبھر ہو گیا لہٰذا اس اخبار کے دفتر کو لاہور سے اپنے گاؤں کرم آباد ضلع گوجرانولہ میں منتقل کیا۔ اس زمانے میں اس کی اشاعت دو ہزار سے زائد تھی۔ اس دوران مولانا ظفر علی خان حیدرآباد دکن میں دکن ریویو کے مدیر کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دے رہے تھے۔ نومبر 1909 میں مولانا ظفر علی خان نے وطن واپس آ کر زمیندار کے انتظام سنبھالے۔ آپ نے زمیندار کا آفس لاہور منتقل کیا اور اس کا انداز بدل کر اسے مسلمانوں کا ترجمان بنا دیا جس سے زمیندار کی مقبولیت میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ جنگ طرابلس کے دوران ظفر علی خان نے زمیندار کو روزنامہ میں تبدیل کر دیا اور اس سے میں جنگ کی خبریں خصوصی اہتمام کے ساتھ شائع کرنے لگے۔ یہ اردو کا وہ پہلا اخبار ہے جس نے رائٹر اسوسی ایٹیٹ پریس آف انڈیا سے خبریں حاصل کرنے کا انتظام کیا۔ اس اخبار کے اداراتی عملہ میں مولانا عبداللہ العمادی، مولانا وحید الدین، سلیم پانی پتی اور منشی وجاہت حسین جھنجھانوی جیسے معتبر لوگ شامل تھے۔ مولانا ظفر علی خان ایک بلند پایہ ادیب مقرر اور شاعر بھی تھے لہٰذا ان کے مقالات اور نظموں نے ہر طرف تہلکہ مچا دیا اور ہر طرف زمیندار کا طوطی بولنے لگا۔ اس اخبار کے تعلق سے مولانا محمد علی جوہر لکھتے ہیں:

''یہ پرچہ اس لیے عروج کو پہنچا کہ ایک ایسے شخص نے اس کی ادارت سنبھالی جو نہایت قابل ہے۔ علی گڑھ کا گریجویٹ ہے۔ ہندوستان کے ایک سے زیادہ صوبوں میں نظم و نسق کا تجربہ رکھتا ہے۔ جدید تمدن اور سیاست سے آگاہ ہے۔ انگریزی محاسن کی قابلیت کا حامل ہے۔ اردو نثر میں درخشاں اسلوب کا مالک ہے اور شعر و شاعری پر اسے کامل عبور ہے اور اب صورت یہ ہو گئی ہے کہ زمیندار کے مقابلے ہر دوسرے اخبار پھیکے اور بے مزہ ہوتے ہیں۔''

(بحوالہ۔ کامریڈ 22 مارچ 1912۔ ص 68)

زمیندار کی جرأت مندی اور بے باکی سے حکومت ناراض ہو گئی اور اس اخبار کو بند کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ غرض زمیندار پر جنگ کی خبریں شائع نہ کرنے کی پابندی لگا دی گئی جس کے نتیجہ میں اس پابندی کے خلاف احتجاج کے طور پر یہ اخبار بند کر دیا گیا۔

ہمدرد اخبار:

ہمدرد اخبار 23/فروری 1913 کو جاری کیا گیا۔ اس اخبار کے مدیر مولانا محمد علی جوہر تھے۔ مولانا نے نئی نئی تازہ خبروں کے لیے خبر رساں ایجنسیوں، رائٹرز اور اسوسی ایٹیڈ، پریس آف انڈیا کی خدمات حاصل کیں۔ انھوں نے اس دور میں اس اخبار کو جاری کیا جس دور میں زمیندار کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ ہمدرد نے زمیندار کی جوشیلی صحافت کے مقابلے میں سنجیدہ، متین اور مدلل صحافت کا راستہ اختیار کیا۔ اس کے علاوہ مولانا محمد علی جوہر انگریزی زبان میں ''کامریڈ'' نام سے ایک اخبار نکالتے تھے جو اس قدر معیاری تھا کہ انگریز وائسرائے اس کا شائق تھا۔

الہلال:

الہلال اخبار کو اردو صحافتی دنیا کا سرتاج مانا جاتا ہے۔ اسے مولانا ابوالکلام آزاد نے 13/جولائی 1912 کو کلکتہ سے جاری کیا۔ اس کے اجراء سے قبل مولانا آزاد المصباح، احسن الاخبار، لسان الصدیق، وکیل اور دار السلطنت وغیرہ مختلف اخبارات سے وابستہ رہ چکے تھے مگر وہ ان سے الگ ایک اخبار نکالنے کے خواہش مند تھے اور الہلال اسی دیرینہ خواب کا ثبوت تھا۔ یہ اخبار جلال و جمال کا امتزاج تھا۔ اس اخبار میں اسلام عالم اسلام کے بارے میں خبریں، مضامین شائع ہوتے تھے۔

یہاں پر بہت سے اہم اور تاریخی اخبارات کا ذکر کیا گیا مگر بہت سے ایسے بھی اخبارات ہیں جن کی تفصیل بیان کرنا یہاں ممکن نہیں۔ علاوہ ازیں کچھ اور اردو اخبارات کا ذکر یہاں اجمالاً کیا جا رہا ہے۔ حامد انصاری کی ادارت میں بجنور سے مدینہ (1912) جاری ہوا۔ پرتاپ لاہور 30

مارچ1919ء مدیر مہا شئے کرشن پرشاد ملاپ 13 اپریل 1923 مدیر لالہ خوشحال چند خورشید اور تیج دہلی 1923 مدیر لالہ دیش بندھو گپتا شامل ہیں۔ دیگر اخبارات میں خدنگ نظر (مدیر منشی نوبت رائے) وندے ماترم 1920 (مدیر لالہ لجپت رائے) الامان بجنو1921ر (مدیر شاہ امان اللہ)' ریاست دہلی 1924 (مدیر سردار سنگھ مفتوم) رن بیر کشمیر 1924' سچ 1925' (مدیر مولانا عبدالماجد دریابادی) جمیعت دہلی 1925 (جمعیۃ علمائے ہند) انقلاب لاہور 1927 (مدیر عبدالملک سالک اور مولانا غلام رسول مہر) وحدت دہلی 1928' پیغام 1931' • مدیر عبدالرزاق ملیح آبادی) صدائے عام پٹنہ 1938 (مدیر نذیر حیدر) ہندوستان 1939 (مدیر غلام احمد خان آرزو) نوائے وقت لاہور 1940 (مدیر حمید نظامی) جنگ دہلی 1942' کراچی 1947' اور قومی آواز لکھنو 1944 (بانی جواہر لال نہرو مدیر حیات اللہ انصاری) قابل ذکر اخبارات ہیں۔

عصر حاضر میں اردو صحافت اپنی تمام تر ٹکنالوجی کے سبب تمام ذرائع کو پورے اعتماد و یقین کے ساتھ برت رہی ہے اور گلوبلائزیشن کے اس دور میں اردو اخبارات و دیگر زبانوں کے اخبارات کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر چل رہی ہے جس کے سبب نہ صرف ان کے اعداد و شمار میں اضافہ ہو رہا ہے بلکہ تعداد اشاعت میں بھی کافی بہتری نظر آرہی ہے۔ ایک RNI سروے کے مطابق اردو اخبارات کا مجموعی سرکولیشن تقریباً ایک کروڑ تک پہنچ چکا ہے۔

عصر حاضر میں اردو اخبارات اعلی درجے کی پرنٹنگ مشینوں کے ذریعہ طبع ہو کر اپنے قارئین سے داد وصول کر رہے ہیں لیکن اردو اخبارات نے وہ دور بھی دیکھا جب

دو ملک کی دیگر زبانوں کی طرح اردو اخبارات کی طباعت بھی لکڑی پر کھدائی کر کے تیار کئے گئے حروف تہجی سے ہوئی تھی۔

اردو اخبارات طویل عرصے تک نامساعد حالات کا شکار رہے ہیں۔ اسی لیے اردو صحافیوں میں محنت اور لگن کا جذبہ شروع ہی سے موجود ہے۔ خبروں کی حصولیابی سے لے کر طباعت کے مسائل تک اردو اخبارات نے جو کٹھن دور دیکھا اگر یہ کسی اور زبان کی صحافت ہوتی تو نہ جانے کب کا ختم ہو چکی ہوتی مگر اردو صحافی ان مشکل حالات میں بھی اخبارات کو خون سے سینچتے رہے۔

کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کی آمد کے سبب اردو صحافت کی جدید کاری انفارمیشن ٹکنالوجی کی دنیا میں ایک بڑا انقلاب برپا ہوا۔ صحافت کے معنی ہی تبدیل ہو گئے۔ اردو صحافت بھی اس سے پیچھے نہیں رہی بلکہ اس انقلاب سے بھرپور استفادہ کیا اور اس کے سبب اردو صحافت کی دنیا پوری طرح بدل کر رہ گئی۔ طباعت، اشاعت اور تدوین کے ذرائع تبدیل ہو گئے۔

اردو صحافت کو آج اس دور تک پہنچانے میں جن جن بزرگ صحافیوں نے ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں انھیں خراج عقیدت پیش کرنا ہمارے لیے لازم ہے کیونکہ اگر یہ لوگ اس میدان میں آگے نہیں آتے تو آج ہم ان تمام نعمتوں سے محروم رہتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آج اردو صحافت و دیگر زبانوں کی صحافت کے آگے شانہ بشانہ اپنی ایک الگ پہچان بنا رہی ہیں اور اردو میں بھی بعض ایسے اخبارات نکل رہے ہیں جو اپنے معیار، انفرادیت، دلکشی اور تنوع کے لحاظ سے بشمول انگریزی تمام زبانوں کے ہم پلہ ہیں۔

چونکہ اردو صحافت ایک مقصد کے تحت وجود میں آئی تھی۔ آج اپنی ابتداء سے 200 سال بعد بھی اس میں مقصدیت اور جرأت مندی بدرجہ اتم موجود ہے۔ یہ کہنے میں کوئی عار نہیں ہے کہ دیگر زبانوں کے مقابلے میں اردو اخبارات ملک و قوم اور سماج کے تئیں اپنی ذمہ داری ادا کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں۔

اردو صحافت کی تاریخ کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو صحافت نے ہندوستان کی تعمیر و ترقی میں نمایاں رول انجام دیا۔ بہت سے نامور ادیب اور صحافی اردو اخبارات سے وابستہ رہے۔ انھوں نے بیش بہا علمی و صحافتی خدمات انجام دیں۔ یہ بات بڑے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اردو صحافت کا مستقبل روشن ہے۔ آج بھی ہزاروں کی تعداد میں اردو اخبارات شائع ہو رہے ہیں اور سرکیولیشن کے اعتبار سے بھی بہت سے اخبارات کی تعداد دوسری زبانوں کے مقابلے میں کسی طرح کم نہیں ہے۔ طباعت میں رنگا رنگی' مواد میں تنوع اور معیار میں کافی بہتری دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح اردو صحافت کی تاریخ درخشاں ہے اسی طرح اردو صحافت کا مستقبل بھی تابناک اور روشن ہے۔

□□□

Dr. Sumayya Tamkeen
Assistant Prof. (Contract) Urdu
Dr.B.R.Ambedkar Open University
Prof G Ram Reddy Marg
Road No:46,Jubilee Hills
Hyderabad-500033 (Telangana State)

معراج الاسلام مصباحی

اردو میں نسائی مکتوبات

خطوط نویسی انسانی معاشرہ کا انتہائی محبوب مشغلہ رہا ہے۔ خطوط سے اس وقت کے سماجی ڈھانچے، رسم ورواج، رہن سہن، تہذیبی برتری، قومی شکست وریخت، علمی وادبی مسائل، ذاتی احوال وکوائف، امور خانہ داری، مصروفیات زندگی، شادی بیاہ کے تہنیتی پیغامات وغیرہ۔ غرض کہ وہ سارے مسائل وامور جو انسانی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں، ان کی جھلک خطوط میں دکھائی دیتی ہے۔ اس لیے یہ مکاتیب اپنے عہد کی منضبط ومبسوط اور مستند دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مکتوب نگاری کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مرد مکتوب نگار کے خطوط تو منظر عام پر آتے رہے جن سے شخصی اظہار، فن، نجی زندگی کے مسائل ومصروفیات، ناقدانہ بصیرت، ان کے عہد کی سماجی، تاریخی اور معاشرتی روایات، اسلوب نگارش وغیرہ سے بخوبی واقفیت ہوتی ہے۔ نیز ان سے مردوں کے رویے کا بھی علم ہوتا ہے۔ لیکن انسانی آبادی کا نصف شمار کی جانے والی خواتین کے مکتوبات منظر عام پر آنے سے ایک زمانے تک مانع تھے۔ شاید اس کی وجہ اس زمانے کی معاشرتی روایت، مرد اساس معاشرہ اور خود خواتین کے احتیاط پسند رویے رہے ہوں۔

خواتین مکتوب نگاروں کا اولین نمونہ خطوط ''بیگمات اودھ کے خطوط'' کی صورت میں سب سے پہلے ملتا ہے۔ اس کو ''بیگمات اودھ کے خطوط'' کے نام سے مفتی انتظام اللہ شہابی نے ترتیب دے کر شائع کیا۔ اس میں بعض خطوط نثر میں ہیں اور بعض نظم کی صورت میں۔ ان مراسلات میں ہجر ووصال، اشتیاق وفراق اور سوز وساز کے علاوہ 1857 کے ہنگامہ خیز ماحول کی عکاسی بھی ہے۔ ان خطوط کی اہمیت ادبی ہونے کے ساتھ ساتھ تاریخی بھی ہے۔ کیوں کہ ان سے نہ صرف واجد علی شاہ اور اس کی بیگمات کی عکاسی ہوتی ہے بلکہ اس وقت کا مکمل منظر نامہ قاری کی نگاہوں کے سامنے ہوتا ہے۔ ایک متمول اور خوش حال سلطنت سے لے کر زوال پذیر سلطنت کے تقریباً پورے احوال ان خطوط سے معلوم کیے جاسکتے ہیں۔ ان خطوط میں 1857 کی جنگ آزادی کا بیان بھی ہے۔ ان خطوط پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر خلیق انجم تحریر کرتے ہیں:

> ''ان خطوط میں اس عورت کی جھلک دکھائی دیتی ہے جو جاگیردار طبقے کے ہاتھوں ذلیل وخوار تھی۔ جس کی ساری زندگی ایک ایسے انسان سے بھیک مانگتے گزر گئی جو وفا سے ناآشنا ہوتا اور جو دولت کے بل پر دنیا کی ہر خوب صورت عورت پر اپنا پیدائشی حق سمجھتا تھا''۔

(تعبیر وتفہیم، مکتبہ جامعہ نئی دہلی 1996 ص 100)

ایک عرصہ تک خواتین کے خطوط ہم کو دستیاب نہیں ہوتے جب کہ

بعد کے زمانے میں مرد ادبا و شعرا نے اپنے دورِ اسیری میں جو مراسلات نگاری اپنی بیگمات سے کی ہے اس کے نمونے کتابی صورت میں ہمارے سامنے ہیں۔ مثلاً ''نقوش زنداں'' (سجاد ظہیر کے خطوط بیوی رضیہ سجاد ظہیر کے نام) ''صلیبیں میرے دریچے میں'' (فیض احمد فیض کے خطوط بیوی ایلس فیض کے نام) کو کافی شہرت حاصل ہوئی۔

یوں تو خواتین کی پسندیدہ صنف اور سامان دلچسپی فکشن: ناول اور افسانے میں رہی ہے لیکن غیر افسانوی اصناف خاص طور پر مکتوب نویسی سے عدم دلچسپی اس وقت کی معاشرتی اقدار اور تہذیبی عناصر میں مضمر ہے۔ مکتوب نگار خواتین کی تعداد قلیل ہی سہی لیکن انھوں نے جرأت سے کام لیتے ہوئے اپنے دل پر گزرنے والی کیفیات کو صفحہ قرطاس پر رقم کر کے اپنے دوستوں اور اپنے اعزواقربا کو ارسال کیا۔ باوجود اس کے کہ مکتوب نگاری ذاتی اور نجی نوعیت کی صنف خیال کی جاتی ہے۔ لوگوں نے خواتین کے خطوط کو شائع کر کے ان خواتین کے ادبی ذوق، قلبی اور ذہنی کیفیات، اور اندازِ تحریر کو قارئین سے روشناس کرایا جن سے تحقیق کا دروازہ وا ہوا۔

اٹھارہویں صدی میں خواتین کے لیے پڑھنے کی وکالت تو معاشرے کے اربابِ حل وعقد کرتے تھے۔ لیکن ساتھ ہی ان کے قلم پر قدغن لگانے کی پرزور اپیل بھی کرتے تھے۔ جس نے متوسط طبقے کے مسلم خانوادوں میں اس خیال کو جنم دیا کہ عورتوں کا تعلق پڑھنے سے ہے لکھنا ان کے دائرہ اختیار سے باہر کی شے ہے۔ باوجود اس کہ اس وقت کی بعض خواتین نے جرأت و بہادری کا مظاہرہ کیا اور جو دل پر گزرتی رہی، قرطاس وقلم کے توسل سے رقم کرتی رہیں۔ جس کی وجہ سے ان کے مکاتیب کے مجموعے منظرِ عام پر آئے۔ ویسے بھی پڑھنے اور لکھنے کی پابندی تو معاشرے کی عام خواتین پر عائد تھی۔ مگر اس کی اجازت معاشرے کے سربرآوردہ گھرانوں، شہزادیوں، بیگمات اور اربابِ نشاط کے لیے تھی۔ اس باب میں خواتین کے مکاتیب کے مجموعے ''بیگمات اودھ کے خطوط اور مخزن اسرار سلطانی'' دلیل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جبکہ خواجہ احمد فاروقی نے اپنی کتاب ''مکتوبات اردو کا ادبی و تاریخی ارتقا'' میں نو مجموعوں کا ذکر کیا ہے۔ مخزن اسرار سلطانی کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''مخزن اسرار سلطانی معروف بہ رقعات بیگمات (قلمی) کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد دکن، مرتبہ محمد امتیاز علی خاں نجیب ساکن شہر فرخ آباد۔ یہ رقعات ان بیگمات کے ہیں جن کو حضرت واجد علی شاہ خود کلکتہ تشریف لے جاتے وقت شہر لکھنؤ چھوڑ گئے تھے۔''

(مخزن اسرار سلطانی (قلمی) آصفیہ نمبر 1991، ص 373)

''بیگمات اودھ کے خطوط'' میں عبدالحلیم شرر نے اس میں ڈیڑھ سو خطوط کا تذکرہ کیا ہے اور ان خطوط کو جب بادشاہ پڑھ لیتے تو ان کو ''بیت الاحرار'' میں محفوظ کر دیا جاتا تھا اور ان کو 'تودے نامے' سے موسوم کیا جاتا تھا۔ بیگمات کی رنگین آرائیوں سے متعلق رسالہ دلگداز ص ۱۲۳ پر لکھتے ہیں:

> ''میری انشاپردازی کا پہلا نصاب یہی ''تودونامے'' تھے جو ظاہری صورت اور باطنی رنگ عبارت دونوں حیثیت سے بہت دلکش تھے۔''۔ (ایضاً، ص 123)

بیگمات کے اس مجموعہ خطوط کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن ان خطوط کے اسلوب اور انشاپردازی پر تشکیک کا پہلو غالب ہے۔ کیونکہ ان خطوط کی رنگین بیانی، اسلوب نگارش اور انشاپردازی مکتوب نگار کا تعلیم یافتہ ہونے کا متقاضی ہے۔ جب کہ کئی بیگمات ایسی تھیں جو لکھنے پڑھنے سے نابلد اور ناآشنا تھیں۔ انھیں بیگمات میں شیدا بیگم ہیں جن کے سب سے زیادہ خطوط ہیں کیونکہ وہ بادشاہ کی سب سے زیادہ منظورِ نظر تھیں اور پڑھنے لکھنے کی خوبیوں سے ناآشنا تھیں جو بیگمات پڑھنے اور لکھنے کی خوبیوں سے ناآشنا ہوتی تھیں وہ صاحب کمال منشیوں اور کاتبوں کی مدد لیتی تھیں۔

ان مکتوبات میں زیادہ تر فراق وجدائی کے لمحات ہیں گویا یہ ہجر نامے ہیں۔ اس کے علاوہ 1857 کے پرآشوب دور کا بیان ہے۔ ان خطوط کے ذریعے لکھنؤ میں سیاسی سازشوں، انگریزوں کے ظالمانہ رویوں اور بیگمات کی بے بسی اور مجبوریوں کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ان کا اسلوب تو ردیف و قافیہ کی قید سے آزاد ہے۔ لیکن تشبیہات واستعارات کا استعمال جابجا ملتا ہے۔ انگریزوں کی ستم ظریفی کا بیان ملاحظہ ہو:

> ''جس وقت یہاں سب کو قتل کیا جتنے کلکتہ میں ہیں ان کی جان کا ہے کو رہے گی۔ ایک نے کہا کہ ہم تم ہی نہ بچیں گے۔ کس واسطے فرنگیوں کا جال مثل گھاس کی جڑ ہے۔ جتنا کاٹو اتنا ہی بڑھتا ہے۔''۔ (بیگمات اودھ کے خطوط، ص 50)

خواتین مکتوب نگاروں کی روایت میں ایک نام عطیہ فیضی کا ہے۔ ان کی خط و کتابت شبلی نعمانی سے تھی۔ لیکن شبلی نعمانی کے نام لکھے ہوئے عطیہ کے خطوط دستیاب نہیں ہیں۔ جب کہ ان کے جوابی خطوط کے حوالے شبلی کے خطوط میں جابجا ملتے ہیں۔ خطوط شبلی میں موصوفہ کے خطوط سے ان کی ذہنی افتاد اور نفسی رویے اور کردار کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

بی اماں اور بیگم حسرت اس دور کی نمائندہ خواتین ہیں۔ مکتوب نگار خواتین کی روایت میں ان کا نام بھی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ خواتین دلیری اور شجاعت میں اپنی مثال آپ تھیں۔ انھوں نے مشرقی نسوانی

کرداروں سے الگ اپنی شناخت قائم کیں۔ حسن افزا چیزوں کو ترک کر کے چھوئی موئی نشاط النسا، بیگم حسرت موہانی کے نام سے مشہور ہوئیں۔ حسرت موہانی جب جرم بغاوت کے الزام میں جیل میں بند ہوئے تو ان کی اہلیہ نے 1908 میں سیاسی میدان میں قدم رکھا۔ اسی زمانے میں بیگم حسرت موہانی کو خطوط کا سہارا لینا پڑا۔

آزادی کے بعد خواتین مکتوب نگاروں کی روایت میں صفیہ اختر کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ ان کے خطوط کے دو مجموعے: ''حرف آشنا'' اور ''زیرلب'' ہیں۔ دراصل یہ خطوط صفیہ نے اپنے ہم دم و ہم ساز رفیق حیات جاں نثار اختر کو تحریر کیے تھے۔ ان دو مجموعے میں شامل خطوط کا دورانیہ اکتوبر 1943 سے دسمبر 1952 تک پھیلا ہوا ہے۔ جاں نثار اختر نے ان کو ترتیب دے کر مذکورہ ناموں سے شائع کیا۔ 'حرف آشنا، میں اکتوبر 1943 سے نومبر 1947 تک کے خطوط شامل ہیں۔ جب کہ زیر لب دسمبر 1949 سے دسمبر 1953 تک لکھے گئے خطوط پر مشتمل ہے۔

اگر صفیہ کے ان خطوط کا جائزہ لیا جائے تو ان کو محبت نامے اور ہجر نامے سے بھی موسوم کیا جا سکتا ہے۔ صفیہ ان خطوط کو اس وقت تحریر کرتیں جب ان کو جاں نثار اختر کی آغوش محبت سے محرومی کا احساس ستاتا۔ انھوں نے ہم کلامی کی خواہش کی تکمیل کی غرض سے انھیں خطوط کا سہارا لیا۔ ہم کلامی کی چاہت میں تحریر کیے گئے یہ خطوط فطرت انسانی کے غماز ہیں۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ جنس مخالف کی طرف رغبت و میلان رکھتی ہے اور یہ رغبت اس وقت مزید بڑھ جاتی ہے جب ان کے مابین ازدواج کا پاکیزہ رشتہ منسلک ہو جائے۔ شادی کے بعد عورت کی تمام تر خواہش اپنے شوہر کی آغوش محبت اور رفاقت ہوتی ہے۔ عدم تکمیل کی صورت میں وہ ہر اس چیز کا سہارا لیتی ہے جو اس کا معقول بدل ہو اور اس سے ہم کلامی کی خواہش بھی پوری ہو۔ اس ضمن میں چٹھی، رقعہ، خط یا عصر حاضر میں جدید سائنسی اور تکنیکی آلات وغیرہ کا ذکر ہے۔ صفیہ نے اپنی خواہش کی تکمیل کا آخری سہارا مکتوب نگاری میں تلاش کیا اور غبار خاطر سپرد قلم کرتی چلی گئیں۔

ان کے خطوط کا پہلا مجموعہ حرف آشنا ہے جس میں اکتوبر 1943 سے نومبر 1947 تک تحریر کیے گئے خطوط شامل ہیں۔ ان خطوط میں خانگی مسائل، بچوں کی بیماری اور ان کی شرارتیں، خاص طور پر ہجر کی تڑپ، تنہائی کا کرب اور وصال یار کی خواہش وغیر کا بیان ہے۔ خط کا اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''اختر! میں بن تمھارے اب نہیں رہ سکتی اور نہ رہنا چاہتی ہوں، لیکن یہ بھی کہ تمھاری خوشی میرے لیے تمھارے ساتھ سے بھی مقدم ہے۔ پر تمھیں بھی خوش دیکھنے کی آرزو میری زندگی میں صرف بعض لمحوں ہی کے لیے پوری ہو سکی۔ شاید وہی لمحے میری زندگی کا حاصل اور نچوڑ ہیں''۔

(حرف آشنا، تصدیق سہاروی برائے عطیہ بک ڈپو بمبئی 1958 ص 230)

صفیہ کے خطوط میں محض روز مرہ کی گھریلو باتیں ہی نہیں بلکہ خلوص، درد اور وفا کی آگ میں جلتی ایک خاتون کی کہانی بھی ہے۔ نہاں خانہ قلب سے اٹھنے والی ہوک کو قاری محسوس کر سکتا ہے۔ سہل اور سادہ الفاظ میں آہ و کراہ کا سمندر ہے جس میں قاری دوران مطالعہ غوطہ زن ہوتا ہے۔ اسی کو تو خطوط نگاری کا کارنامہ کہا جاتا ہے کہ معمولی کو غیر معمولی اتنی خوبی سے بنایا جائے کہ فن کاری کا راز پردہ خفا میں رہنے کے ساتھ قاری کے قلب و احساس میں آشکار ہو جائے۔

جاں نثار کا مطالبہ کہ تم اپنا اور بچوں کے احوال تفصیل سے لکھو۔ اس کے جواب میں صفیہ اپنے خط مرقومہ 5 ستمبر 1947 میں لکھتی ہیں:

> ''اپنا حال کیا لکھوں۔ ویران شامیں اور مکدّر صبحیں۔ یہ ہے زندگی کا پروگرام۔ مگر امید کا چراغ گل نہیں ہوتا دوست۔ کبھی تو میری زندگی بھی مسکرائے گی''۔ (ایضاً ص 236)

صفیہ اختر کے خطوط کا دوسرا مجموعہ ''زیرلب'' ہے۔ اس میں دسمبر 1949 سے دسمبر 1953 تک کے خطوط شامل ہیں۔ اس میں شامل تمام خطوط کا تعلق زوجین کے مابین مسائل سے ہے۔ دراصل صفیہ کی بے لوث چاہت اور خود کلامی میں لکھے گئے یہ خطوط بھی ان کے مشرقی تہذیب کی پروردہ خاتون اور بیوی ہونے کے عکاس ہیں۔ محبت کا جوہر صفیہ کی ذات میں کس طرح رچا بسا ہے اس کا صحیح اندازہ ان مکاتیب کے مطالعہ سے کیا جا سکتا ہے۔ یہ جہاں ہمیں جاں نثار کی محبت میں مر مٹنے کے جذبے کی عکاسی کرتے ہیں وہیں یہ بھی بتاتے ہیں کہ ان کے معاصر ادیبوں اور اہل علم سے ان کے تعلقات کیسے تھے۔ عصمت سے اچھے تعلقات کا ادراک درج ذیل اقتباس سے ہو رہا ہے:

> ''تمھیں کل ہی پیسہ روانہ کروں گی۔ تمھیں اس طرف سے واقعتاً سخت تکلیف ہوگی۔ بے تکلف ہر ضرورت اور ہر پریشانی سے مطلع کرتے رہو۔ ہاں عصمت آپا کے یہاں ایک آدھ ماہ گزارا کر لو تو اچھا ہے۔''

(زیرلب، صفیہ اکیڈمی حیدرآباد ص 15)

قرۃ العین حیدر کا نام خواتین فکشن نگار کی دنیا میں سرفہرست ہے۔ ان کے افسانوی ادب کی فضا میں تاریخ و فلسفہ کی آمیزش نے ان کو ایک امتیازی شناخت عطا کی۔ نثری ادب کی تمام اصناف ناول، افسانہ،

خاکہ، رپورتاژ وغیرہ میں طبع آزمائی کی اور ایک کامیاب و مؤثر نثر نگار کی حیثیت سے اپنے آپ کو تسلیم کروایا۔ ان کی تصنیفات کے علاوہ ان کے خطوط بھی ہیں جو ان کی شخصیت کو مکمل طور پر سمجھنے میں معاون و مددگار ہیں۔ وہ اپنے معاصرین کو ضرورت کے تحت ہی خط تحریر کیا کرتی تھیں۔ وہ خود ہی ایک خط: بنام خالد حسن مرقومہ 15 فروری 1982 کو لکھتی ہیں:

> ''میں بہر حال دنیا کی عظیم ترین خطوط نویس نہیں۔ برسوں خطوط کے جواب نہیں دے پاتی۔ ایک مرحلہ معلوم ہوتا ہے۔ الاّ شدید ضروری خطوں کے۔ اور انھیں عزیزوں اور دوستوں کو لکھتی ہوں جن کو لکھنے کو جی چاہتا ہے۔ تم اس دوسرے زمرے میں شامل ہو''۔

(قرۃ العین حیدر کے خطوط ایک دوست کے نام، خالد حسن، سٹی پریس بک شاپ کراچی 2002ء ص:42)

قرۃ العین حیدر کے خطوط کا واحد مجموعہ خالد حسن نے سٹی بک پریس کراچی سے 2002 میں شائع کیا۔ اس کی اشاعت میں عینی کی پیشگی اجازت تھی۔ عینی نے دامان باغباں کے نام سے بھی خطوط کا ایک مجموعہ ترتیب دیا لیکن اس میں وہ خطوط ہیں جو معاصر مشاہیرین ادب نے عینی کے نام تحریر کیے تھے۔ عینی کی طرف سے تحریر کیے گئے مختلف ادیبوں کے نام گیان چند جین، نثار احمد فاروقی، خلیق انجم، صالحہ عابد حسین وغیرہ کے خطوط انجمن ترقی اردو دہلی کی آرکائیوز میں محفوظ ہیں۔ ان کے مطبوعہ خطوط دور کی آواز میں جیلانی بانو کے نام تحریر کردہ اور نقوش (لاہور) کے مکاتیب نمبر میں اور دیگر کتب و رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ ان خطوط کی روشنی میں عینی کی شخصیت اور فن کا ناقدانہ مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

پروین شاکر نے جو خطوط نظیر صدیقی کے نام لکھے ان سے ان کے آبائی وطن اور Nick Name کا پتہ چلتا ہے۔ پروین کے وطن مالوف کی شہرت پاکستان سے ہے کیوں کہ تقسیم ہند کے وقت ان کے آباؤ اجداد ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے اور اسی کو اپنا دائمی مسکن بنا لیا وہ لکھتی ہیں:

> ''بہر کیف میرے والدین کا تعلق صوبہ بہار کے شہر پٹنہ اور ضلع لہریا سرائے سے ہے۔ ہمارے گاؤں کا نام چندن پٹی ہے۔ لیکن چوں کہ میں پیدا یہیں ہوئی۔ میری Schooling اور تربیت یہیں کی ہے۔ لہٰذا اس سرزمین کو میں بس اپنے ماں باپ کے حوالے سے ہی جانتی ہوں''۔

(پروین شاکر کے خطوط، نظیر صدیقی کے نام ص 15)

پروین شاکر جس ناقدانہ بصیرت کی حامل تھیں اس کا صحیح اندازہ ان کے بعض خطوط بنام نظیر کے مطالعہ سے ہوتا ہے۔ زندگی کا فلسفہ اور ادب کی پرکھ کا پہلو ان کے یہاں واضح اور متعین ہے۔ ان کی قطعیت نے ان کو ادب اور زندگی کے فلسفوں کے پیچ و خم میں الجھا کر نہیں رکھا۔ اپنے سادہ اور پراثر اسلوب میں اپنے فن اور شاعری پر ناقدانہ اظہار خیال کرتی ہوئی تحریر کرتی ہیں:

> ''جذبے کی شاعری کرنا بڑی پیاری بات ہے۔ مگر میری ذاتی رائے، ادب کی ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے یہ رہی کہ 25 برس کے بعد آدمی بطون ذات سے یا کائنات سے اپنے لیے کوئی اور Identification نہ تلاش کر سکے تو پھر وہ اپنے آپ کو دہرانے لگتا ہے۔ میں اپنے آپ کو دہرانا نہیں چاہتی تھی۔ چنانچہ وہ تمام نظریات جو کچی عمر سے میرے لاشعور میں اپنی جگہ بناتے رہے تھے۔ میں نے اپنے آپ کو ان کے سپرد کر دیا ہے۔ اس بہاؤ میں جو موتی ہاتھ لگے۔ اپنے قارئین تک پہنچا دیے۔ ہوسکتا ہے ان میں سے بیشتر پتھر ہی لگیں۔ مگر سفر کا مآل تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ ممکن ہے میں اس Phase سے باہر بھی نکل آؤں۔ مگر فی الحال تو دور دور تک کوئی ایسا امکان نظر نہیں آتا''۔ (ایضاً، ص:67)

بانو قدسیہ کے خطوط میں کتابوں پر سرسری تبصرہ، بچوں کی طبیعت، ذاتی مشغولیات، حیدرآباد شہر کی خوبصورتی، شادی بیاہ کے متعلق استفسار وغیرہ کا بیان ہے۔ اس میں کسی علمی و ادبی بحث کی تلاش کار بے سود ہوگی۔ نمونہ خط ملاحظ ہو:

''حیدرآباد کی سناؤ؟ تمھارے خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ بڑا ہی خوب صورت شہر ہے۔ ہم نے تو اس کی روایات اور تہذیب کے متعلق بھی بہت کچھ سن رکھا تھا۔ مجھے تو وہاں کی تقریری زبان بہت پسند ہے۔ کچھ حیدرآبادی لوگ میرے واقف ہیں۔ ان کی اردو میں بڑے شوق سے سنا کرتی ہوں''۔

(دور کی آوازیں، جیلانی بانو، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس 2010ص:130)

ہاجرہ مسرور کے خطوط کا کوئی باضابطہ مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ ان کی علمی، ادبی اور اکادمی مصروفیات کو دیکھتے ہوئے اس بات کا قوی امکان ہے کہ ان کی ایک سے زائد لوگوں کے ساتھ مراسلت نگاری رہی ہوگی۔ ہاجرہ کے آٹھ خطوط جیلانی بانو کے نام ہیں جن سے ان کے احوال کے ساتھ ان کی تصنیفی و تالیفی مشغولیات کا علم ہوتا ہے۔ ان خطوط میں اپنے محبین اور پیاروں کے احوال و کیفیات، شادی، بیاہ، شوہر کی بے لوث محبت، ذاتی طبیعت کی کیفیت،، لاہور کی گرمی، ہندوستانی فلم، ''مدر انڈیا'' رسالہ ''نقوش'' کی ادارت، مدت دراز سے خطوط تحریر نہ کرنے کی وجہ سے معذرت نامے اور بانو کی تخلیق پر ناقدانہ بصیرت وغیرہ بیان ہے۔ جیلانی بانو کے ناولٹ کے بارے میں غیر جانب دار اور متوازن اظہار خیال کرتی ہوئی تحریر کرتی ہیں:

''تمھارا ناولٹ میں نے فوراً پڑھ ڈالا تھا۔ یوں تو مجھے تمھارا لکھا ہوا ہر لفظ پسند آتا ہے مگر میں نے اور بھی ذوق وشوق سے پڑھا۔ اس کی وجہ ایک اور بھی تھی۔ تین اس قدر موٹی بہنیں میں نے بھی دیکھی ہیں۔ جو دولہا کا انتظار کر رہی ہیں اور کسی قیمت پر یہ ماننے کو تیار نہیں کہ وہ سخت غیر جاذب توجہ ہیں۔۔۔بعض جگہ تو میں اسے پڑھتے ہوئے بڑی اداس ہوگئی''۔ (ایضاً۔ص:545)

آزادی کے بعد کثیر تعداد میں ایسی خواتین ہیں کہ جن کے خطوط منظر عام پر آئے۔ جیسے پروین شاکر، بانو قدسیہ، خدیجہ مستور، کشور ناہید، ہاجرہ مسرور، شفیق فاطمہ شعریٰ، جمیلہ ہاشمی، زاہدہ حنا، رضیہ سجاد ظہیر اور فہمیدہ ریاض وغیرہ۔ ان میں سے کم ہی خواتین ایسی ہیں کہ جن کے خطوط کا باقاعدہ مجموعہ شائع ہوا ہے۔ زیادہ تر خواتین ایسی ہیں کہ جن کے ایک دو یا چند خطوط ''مشاہیر کے خطوط'' نامی جیسی کتابوں میں شامل ہیں یا کسی رسالے کے خاص نمبر جو مکاتیب سے متعلق ہیں، میں شامل ہیں یا ان میں سے کچھ خواتین کے خطوط انجمن ترقی اردو (دہلی) کی لائبریری اور آرکائیوز میں غیر مطبوعہ حالت میں رکھے ہوئے ہیں۔

اردو خطوط کی ادبی تاریخ وروایت کے مطالعہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مرد مکتوب نگاروں کے بے شمار مجموعے منظر عام پر آئے۔ مگر اس امر میں خواتین مردوں سے کافی پیچھے نظر آتی ہیں۔ کیوں کہ ان کے چند ہی مجموعے شائع ہوئے۔ خود نقوش (لاہور) نے دو نہایت گراں قدر خطوط نمبر شائع کیے جن میں 2253 غیر مطبوعہ خطوط شائع کیے گئے۔ جن میں محض چودہ خاتون مکتوب نگاروں کے پچاس خطوط شامل کیے گئے۔ اس غیر مساوی تعداد کے پس پردہ دو وجہیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ معاشرتی زندگی میں عورتوں کو کم اہمیت حاصل تھی۔ گھریلو عورت کے نام اور آواز تک کا پردہ تھا۔ دوسرے یہ کہ سماجی زندگی سے اس دوری کے نتیجے میں وہ پڑھنا لکھنا بھی نہ جانتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ نقوش کے مکاتیب نمبر کی پہلی جلد میں کسی بھی عورت کا کوئی خط شامل نہیں ہے۔ بلکہ مردوں کے خطوط میں بھی عورت کا کسی بھی حوالے سے کسی بھی رشتے سے کوئی حوالہ موجود نہیں ہے۔

تقریباً بیسویں صدی کے آغاز میں عورتوں کی تحریروں کا ذکر سننے پڑھنے میں آتا ہے۔ رومانی تحریک کے زمانے میں عورتیں فلاں بنت فلاں کے نام سے لکھنے لگی تھیں۔ یہ تو ترقی پسند تحریک کی دین ہے کہ جس نے مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کو بھی اپنے وجود کی اہمیت سے روشناس کرایا۔ اس تحریک نے ہی عورتوں کی ذات تک حائل پردوں کو اٹھا کر عورت کے بارے میں معروضیت کے ساتھ سوچنا سکھایا۔ اب عورت اپنے حقوق کی بات کرتی ہے۔ معاشرتی جکڑ بندیوں سے فرار اور فرسودہ رسوم وروایات پر سوالات قائم کرتی ہے۔ اپنی خود مختاری کا مطالبہ کرتی ہے۔ اپنی آزادی رائے کا اظہار کرتی ہے۔ اب عورت مردوں کے شانہ بہ شانہ سیاسی اور سماجی مسائل میں برابری کی حصہ دار سمجھتی ہے۔

□□□

Merajul Islam Misbahi(J.N.U.)
Gandhi Inter College
Sikandar Pur
Ballia-277303 (U.P)
Email. merajmisbahi12@gmail.com
Contact No.:8920421549

سعدیہ پروین

خواتین اور فکشن

اردو زبان وادب میں ادیباؤں کے کارنامے ایک پوری صدی پر محیط ہیں اردو ادب کے اس پورے منظر نامے پر ایک طائرانہ نظر ڈال کر یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ادیباؤں نے اس منظر نامے کو اور بھی دلکش اور جاندار بنانے میں خاصہ رول ادا کیا ہے۔ گزشتہ ایک صدی میں خاتون ناول و افسانہ نگار، مزاح نگار، ڈرامہ نگار، حتیٰ کہ خاتون تنقید نگاروں نے اردو ادب کی بقا میں ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ خاتون اردو ادیباؤں کی خدمت کے پیش نظر اور ان تحریروں کے موضوعات، زبان و بیان مزاج اور منفرد حسیت کی بنا پر یہ تسلیم کرنے میں اعتراض نہیں ہونا چاہیے کہ ادب ایک جداگانہ صورت اختیار کر چکا ہے۔ اس تمام سرمائے کو معقول دلائل کی بنا پر خواتین اردو ادب یا تانیثی اردو ادب کے زمرے میں بھی شمار کیا جا سکتا ہے۔ اردو زبان کی مختلف اصناف میں اردو ادیباؤں کی گراں قدر خدمات کا جائزہ گو کہ وقت کی اہم ضرورت ہے تاہم اس مطالعہ میں صرف فکشن نگار کو ہی شامل کیا گیا ہے۔

یوں تو خواتین اردو ادب کے افق پر انیسویں صدی کے آخری ایام میں ہی نظر آنے لگی تھیں۔ لیکن باقاعدہ طور پر وہ بیسویں صدی کے آغاز سے سرگرم عمل ہوئیں۔ یہ خواتین اردو ادب کا پہلا دور گردانا جا سکتا ہے۔ اس دور کی شروعات میں خواتین اردو ادب کے دو دلچسپ پہلو نظر آتے ہیں اوّل یہ کہ مخصوص سماجی اور ثقافتی صورت حال کے پیش نظر کچھ ادیبائیں اپنی اصلی ناموں کے تحت شائع ہونے سے کتراتی تھیں۔ ان کی تخلیقات فرضی ناموں سے شائع ہوئی تھیں۔ ان فرضی ناموں کے تعلق سے بیگم شاہنواز، مسز عبدالقادر، ز۔ خ۔ ش، (زہرا خاتون شیروانی) والدہ افضل علی، مسز الف ظ، حسن وغیرہ کے نام نظر آتے ہیں یہاں تک کہ بیگم صالحہ عابد حسین کو ہمشیرہ غلام السیدین کے نام سے اپنے مضامین کافی عرصے تک شائع کراتی رہیں۔

اس دور کے خواتین اردو ادب کا دوسرا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ بیشتر ادیبائیں ڈپٹی نذیر احمد صاحب کی تحریروں سے نہ صرف متاثر نظر آتی ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد صاحب کی دو تصنیفات ''مراۃ العروس'' اور بنات النعش بالترتیب 1869 اور 1888 میں شائع ہو کر متوسط اردو داں مسلم خواتین میں کافی مقبول ہو گئیں۔ ان دونوں تصانیف میں بقول مصنف ''عورتوں کی اصلاحِ حالت اور تمدن میں ان کو زیادہ کارآمد بنانا مقصود ہے۔'' ڈپٹی نذیر احمد نے مراۃ العروس میں اصغری کے کردار کو ایک رول ماڈل کے طور پر پیش کیا تھا جو تعلیم کے زیور سے آراستہ تھی۔ امور خانہ داری میں بھی ماہر تھی۔ یہ کردار ادیباؤں کے لیے اہم موضوع بن گیا تھا۔ ڈپٹی نذیر احمد نے اصغری کے کردار کو اکبری کے کردار کی ضد بنا کر پیش کیا۔

اس کے بعد اردو نثر میں خواتین نے لکھنا تب شروع کیا جب سر سید تحریک اپنے شباب پر تھی اور مسلم معاشرہ میں متوسط طبقہ آنکھیں کھول رہا تھا۔ اس دور کی ادیباؤں میں سیدہ النساء، اکبری بیگم، عباس طیب جی، صغریٰ ہمایوں مرزا، بیگم شاہنواز، مسز عبدالقادر حجاب امتیاز علی وغیرہ اہم ادیبائیں ہیں جو اب تقریباً نایاب ہیں اور ان کے موضوعات اکثر و بیشتر تعلیم نسواں، لڑکیوں کی کمسنی میں شادی کے مضر اثرات اور مشرقی عورت کی روایتی وفاداری پر مبنی ہیں۔ یہ ادیبائیں، اصغری کے کردار کی طرز پر اپنی

تحریروں کو ایک مثالی عورت ایک فرمانبردار بیٹی، وفادار بیوی اور مثالی ماں باپ کے روپ میں سامنے آتی ہے۔ یہ تحریریں دراصل ڈپٹی نذیر احمد کے اصلاح النساء ایجنڈہ کی ایک توسیع ہے۔

صغریٰ ہمایوں مرزا کا پہلا ناول مشیرِ نسواں 1906 میں شائع ہوا۔ بقول ناز قادری، ''مشیرِ نسواں'' کی وجہ تسمیہ ہے کہ اس میں طبقۂ 'نسواں' کے لیے مفید و کارآمد پند و نصائح کا ذخیرہ ہے جو خواتین کی معاشرتی زندگی میں مشعل راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

قمر رئیس نے ایک سیمنار میں عورت کو ام القصص کہا۔ جو خود قصہ کا موضوع بھی ہے قدرت نے اسے قصہ گوئی اور افسانہ طرازی کا ملکہ بھی عطا کیا۔ قصے میں اسے تکنیک کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا رہا ہے پھر بھی کیوں افسانوی ادب میں اتنی اہمیت کے باوجود ان کی صلاحیتوں کو بھرپور اظہار کا موقع نہیں مل سکا۔ آخر اس محرومی کے اسباب کیا تھے۔ اس وقت جاگیردارانہ نظام کی مجبوریاں، تحفظ و کفایت کے مسائل، سماج میں عوت کے ساتھ ناروا سلوک، جہالت، تعلیم نسواں کا فقدان اور کتابوں کی اشاعت میں دشواری ایسے پہلو تھے جس نے عورت کی صلاحیتوں کو بیدار ہونے کا موقع نہیں دیا۔ لیکن بنیادی سبب زندگی اور عورت کے بارے میں مرد کا وہ نقطۂ نظر تھا جو تقدیر و تدبیر جبر اور اختیار کے فرق سے ناواقف تھا۔ لیکن جیسے ہی سیاسی و معاشی نظام بدلا سماج میں عام تبدیلیاں آئیں۔ تعلیم کا فروغ عام ہوا تو زندگی اور عورت کے بارے میں نقطۂ نظر بدلنے لگا اور سماج کا ایک بڑا حصہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ ہمیشہ عورت گھر کی چار دیواری میں بند جمود اور زوال کا شکار رہی اور جب تک عورت کو تاریکی کے اس غار سے نہ نکالا جائے گا اور اس کی ذہنی و فکری، جذباتی و تخیلی افق کو وسیع نہیں کیا جائے گا تب تک خواتین کی ترقین کو ممکن نہیں بنایا جا سکتا۔ نتیجتاً بیسویں صدی کی ابتدا میں جب ''خاتون''، ''تہذیب نسواں'' اور ''عصمت'' جیسے رسائل میں خواتین کے مسائل شائع ہوئے بقول قرۃ العین حیدر معمولی تعلیم یافتہ پردہ نشین خواتین میں تصنیف و تالیف کا شوق پیدا ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے انھوں نے بڑی خود اعتمادی کے ساتھ ناول لکھنا شروع کر دیے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ترکی اور وسطی ایشیا کے مسلم معاشرے میں اصلاح و تعلیم کی جدید تحریک برگ و بالا دلا رہی تھی۔ لڑکیاں بھی مغربی طرز کے نئے طریق تعلیم سے بہرور ہو کر زندگی کے ہر میدان میں اپنے انسانی حقوق پانے کی خواہش اور جدوجہد کرنے لگی تھی۔

اردو ادب کی تاریخ میں ایک نیا موڑ اس وقت آیا جب نذر سجاد حیدر اور حجاب امتیاز علی کے فن کی رومانی آراستگی سے گریز کیا۔ قدیم روایت سے بغاوت کرتے ہوئے عالمی منظر نامے پر اپنی گرفت مظبوط کی اور ملک گیر پیمانے پر عالمی مسائل کو اٹھایا اور اردو ادب کو حقیقت شعاری اور ٹھوس بنیاد فراہم کر کے رشید جہاں اور عصمت چغتائی نے کلیدی رول ادا کیا انھوں نے اپنی کہانیوں سے اردو ادب کو ایک روش اور کشادہ راہ پر ڈال دیا۔ اسی حقیقت شعاری سے متاثر ہو کر عصمت چغتائی، رضیہ سجاد ظہیر، صالحہ عابد حسین، قراۃ العین حیدر، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور وغیرہ نے اردو فکشن میں عمدہ مثالیں پیش کیں۔ ان میں رشید جہاں نے اپنے شعور اور ذی علمی کا ثبوت پیش کیا۔

رشید جہاں ہندوستان کے ایک روشن خیال مسلم خاندان کی چشم و چراغ تھیں انگارے میں شامل دس کہانیوں میں دو تخلیقات رشید جہاں کی تھیں۔ افسانہ دلی کی سیر، ڈرامہ، پردے کے پیچھے، ان کی اہمیت آج اس لیے ہے کہ انھوں نے اگرچہ افسانہ نگاری میں کوئی اہم اضافہ نہ کیا ہو لیکن وہ ادب میں ایک نئے دور کے آغاز کی نمائندہ خاتون بن کر ابھریں۔

یہ بات درست ہے کہ رشید جہاں تحریک نسواں اور ترقی پسند تحریک کے مابین ایک اہم کڑی کی شکل میں تسلیم کی جاتی ہیں کیونکہ اس دوران ان جیسی ذی علم نڈر، اور بے خوف لکھنے والی کوئی خاتون نہیں تھی۔ ان کی بے باکی اور روشن خیالی نے دوسری خواتین میں حوصلہ پیدا کیا۔ خاص کر ترقی پسند تحریک ایک حقیقت پر مبنی تحریک تھی۔ جس کے باعث بہت سی خواتین نے اس سے متاثر ہو کر اپنی زندگی کے تلخ حقائق کو ادب میں پیش کیا اور اس کے بعد ہندوستانی عورتوں نے کمر بستہ ہو کر اپنے گھروں سے نکل کر مردوں کے بالمقابل زیر تعلیم حاصل کرنے میں کوئی گریز نہ کیا۔ اس کے علاوہ برٹش حکومت کے آتے ہی انھوں نے Co-Education کو بڑھاوا دینے کی کوشش کی۔ وہ آزاد تھیں حالانکہ اس وقت ملکی حالات سنگین نتائج کے دہانے پر تھے مگر خواتین نے انگریزوں کی آمد سے تقویت حاصل کرتے ہوئے اپنے پست احساس سے تحریک پا کر نئی شروعات کی۔ لہٰذا صغریٰ مہدی لکھتی ہیں:

> ''رشید جہاں اشتراکی تھی اور کمیونسٹ تحریک سے باقاعدہ وابستہ تھی لیکن ان کی کہانیوں میں سماجی بلخصوص مسلم خواتین کے مسائل اور انگریز حکمرانوں کے الگ الگ معیاروں کو موضوع بنایا گیا ہے۔''

صالحہ عابد حسین بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے اختتامیہ پر ادبی افق پر ظاہر ہوئیں۔ انھوں نے تقریباً 42 تصانیف لکھی ہیں۔ انھوں نے فرقہ وارانہ ہم آہنگی، تقسیم ملک سے پیدا شدہ سماجی صورت حال اور فرقہ

وارانہ فسادات سے نڈھال اور زخمی انسانیت کے موضوعات کو بھی اپنے افسانوں میں جگہ دی۔ ان کی تحریروں میں مسلم سماج مروجہ سماجی اور ثقافتی اقدار کے نقوش نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر اپنی باجی کی شادی کے سلسلہ میں لکھتی ہیں ان کی شادی کی بات دو جگہ چل رہی تھیں بالآخر استخارہ کے ذریعہ قرعہ ڈال کر شادی طے کی گئی۔ 1919 کا زمانہ تھا پڑھے لکھے عالم فاضل گھروں میں یہ سب ہوتا تھا۔

رضیہ سجاد ظہیر نے بھی تقریباً صالحہ عابد حسین کے ساتھ ساتھ لکھنا شروع کیا۔ ان کے چار ناول سرشام، کانٹے، سمن، اللہ میگھ دے اور ایک افسانوی مجموعہ ''زرد گلاب'' شائع ہوئے۔ ان کی تحریروں میں ایک اشتراکی خواب یعنی ایک غیر طبقاتی اور سماجی انصاف پر مبنی معاشرے کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ رضیہ سجاد ظہیر کا انداز بیان دلچسپ ہے۔ اپنے افسانے ''زرد گلاب'' میں پھولوں کے استعارے کا استعمال نہایت خوبی سے کیا۔ ''زرینہ بیٹی تم نے ایک دفعہ مجھ سے پوچھا تھا کہ نیاز زرد گلاب گچھے سے الگ کیسے ہو گیا۔ اس وقت تم بہت ننھی سی تھیں۔ میں تم سے کیا بتاتی اور پھر بہت سی باتیں انسان کبھی اپنی زبان پر نہیں لاسکتا۔ اپنی اولاد سے بھی نہیں کہہ سکتا۔ پر وقت آج تمہیں یہ سمجھائے گا کہ کوئی کس مجبوری اور بے بسی کے ساتھ اپنے پیاروں سے الگ ہوتا ہے۔ کوئی بھی پھول گچھے کو چھوڑنا نہیں چاہتا مگر اسے چھوڑنا پڑتا ہے۔''

خواتین اردو ادب میں ایک نئی اور چونکا دینے والی آواز عصمت چغتائی کی ہے۔ ان کی تحریریں بلاشبہ موضوعات اسلوب، کرداروں اور لب ولہجہ کے اعتبار سے تانیثی حسیت اور تانیثی شعور کے اظہار کا پہلا معتبر تجربہ ہیں۔ اس لحاظ سے ان کی تحریں تانیثیت کی پہلی اور مستند دستاویزات ہیں۔ عصمت چغتائی کے موضوعات بالکل منفرد ہیں۔ ان کے افسانوں اور ناولوں میں عورت کے جذبات ذہنی کیفیات، روزمرہ کی وارداتوں پر ان کے نفسیاتی ردِ عمل اور ان کے مخصوص سماجی حالات کی عکس مندی فنکارانہ مہارت سے کی گئی ہے۔ انٹرویو میں کہتی ہیں:

> ''دوپہر کو محلے بھر کی عورتیں جمع ہو کر بیٹھ جاتیں تھیں اور ہم لڑکیوں سے کہا جاتا تھا کہ ''چلو بھاگو تم لوگ'' میں چھپ کر پلنگ کے نیچے گھس کر کہیں سے ان کی باتیں سن لیا کرتی تھی۔ جنس کا موضوع گھٹے ہوئے ماحول اور پردے میں رہنے والی بیویوں کے بہت اہم قصے ہوتے، وہ اس پر بہت بات چیت کیا کرتی ہیں۔ میری ناول نگاری اسی گھٹے ہوئے ماحول کی عکاسی ہے۔''

آہستہ آہستہ وہ سماجی مسائل کی جانب متوجہ ہوئیں اس سلسلے میں ''جڑیں'' ایک اہم افسانہ ہے۔ اس میں عصمت چغتائی نے تقسیم ہند کے حالات و واقعات کو بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے متعدد افسانے ایسے ہیں جو سماج کے حقائق پر مبنی ہیں۔ ان میں افسانہ چھوئی موئی، چوتھی کا جوڑا، دو ہاتھ، چار پائی وغیرہ خاصے اہم ہیں اس کے علاوہ عصمت چغتائی نے تقریباً آٹھ ناول لکھے جن میں ضدی، ٹیڑھی لکیر، معصومہ، سودائی، عجیب آدمی، جنگلی کبوتر، دل کی دنیا اور قطرہ خون شامل ہے ان کی تخلیقی صلاحیت ناول اور افسانے میں نظر آتی ہے۔ ڈراموں میں بھی ان کی یکتائی کو محسوس کیا جا سکتا ہے ہر نئی تخلیق ایک نئے پیغام کے ساتھ آتی ہے جو دلوں کو جھنجھوڑتی چلی جاتی ہے ان کے ڈراموں میں فسادی، پردے کے پیچھے، سانپ، انتخاب، ڈھیٹ، پتے وغیرہ اہم ڈرامے ہیں۔ ان ڈراموں میں موضوع کے اعتبار سے منفرد اور لہجے کی تیز وطراری نے سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے عصمت اپنے افسانوں کی بنا پر بدنام بھی ہوئیں اور نام بھی کمایا۔

قرۃ العین حیدر اردو ادب کی کبھی نہ مکمل ہونے والی ایک عظیم داستان ہیں یہ نہ صرف ایک عظیم داستان بلکہ انتہائی معتبر اور توانا شخصیت ہیں ان کی تحریریں ادبی وفنی خوبیوں کے باعث دنیائے ادب کی ایک شاندار یادگار ہیں۔ ان کی شخصیت میں بے پناہ کشش تھی۔ نیک دل، روشن خیال، بے حد حساس اور شرافت و معصومیت اور شائستگی ان کی شرست میں داخل تھی۔ وہ خوش اخلاق اور خوش مزاج خاتون تھیں۔ ان تمام خوبیوں کی جھلک کہیں نہ کہیں ان کی تحریروں میں نظر آتی ہے۔

قرۃ العین حیدر کو کہانیاں، افسانے اور ناول لکھنے کا ذوق اپنے والد سے وراثت میں ملا تھا۔ ان کی شہرت کے سفر میں سجاد حیدر یلدرم اور نذر سجاد کا نام شامل ہے لیکن وقت کے ساتھ صورتِ حال میں تبدیلی آئی اور اب ان کے والدین کو بقائے دوام قرۃ العین حیدر کی وجہ سے حاصل ہوا۔

ان کی ادبی زندگی کی شروعات کہانی لکھنے کے ساتھ ہوئی اور یہ مانا جاتا ہے کہ پہلی کہانی ''کاٹھ گودام کا اسٹیشن'' انھوں نے چھ سال کی عمر میں لکھی۔ انھوں نے بچوں کے لیے بھی کہانیاں لکھی ہیں۔ ساقی، ہمایوں، ادب لطیف میں ان کی نگارشات مستقل شائع ہوئے۔ 1944 میں ان کا ایک اہم افسانوی مجموعہ 9 ناول اور 5 ناولٹ شائع ہوئے، افسانوی مجموعوں میں ستاروں سے آگے (1944)، شیشے کا گھر (1954)، پت جھڑ کی آواز (1966) اور روشنی کی رفتار (1982) آج بھی مقبول ہیں۔

1947 میں قرۃ العین حیدر نے اپنا ناول ''میرے بھی صنم خانے'' تحریر کیا۔ 1954 میں سفینۂ غم اور 1959 میں اردو کے افسانوی

وارانہ فسادات سے نڈھال اور زخمی انسانیت کے موضوعات کو بھی اپنے افسانوں میں جگہ دی۔ ان کی تحریروں میں مسلم سماج مروجہ سماجی اور ثقافتی اقدار کے نقوش نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر اپنی باجی کی شادی کے سلسلہ میں لکھتی ہیں ان کی شادی کی بات دو جگہ چل رہی تھیں بالآخر استخارہ کے ذریعہ قرعہ ڈال کر شادی طے کی گئی۔ 1919 کا زمانہ تھا پڑھے لکھے عالم فاضل گھروں میں یہ سب ہوتا تھا۔

رضیہ سجاد ظہیر نے بھی تقریباً صالحہ عابد حسین کے ساتھ ساتھ لکھنا شروع کیا۔ ان کے چار ناول سرشام، کانٹے، سمن، اللہ میگھ دے اور ایک افسانوی مجموعہ ''زرد گلاب'' شائع ہوئے۔ ان کی تحریروں میں ایک اشتراکی خواب یعنی ایک غیر طبقاتی اور سماجی انصاف پر مبنی معاشرے کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ رضیہ سجاد ظہیر کا انداز بیان دلچسپ ہے۔ اپنے افسانے ''زرد گلاب'' میں پھولوں کے استعارے کا استعمال نہایت خوبی سے کیا۔ ''زرینہ بیٹی تم نے ایک دفعہ مجھ سے پوچھا تھا کہ نیاز زرد گلاب گچھے سے الگ کیسے ہو گیا۔ اس وقت تم بہت ننھی سی تھیں۔ میں تم سے کیا بتاتی اور پھر بہت سی باتیں انسان کبھی اپنی زبان پر نہیں لاسکتا۔ اپنی اولاد سے بھی نہیں کہہ سکتا۔ پر وقت آج تمہیں یہ سمجھائے گا کہ کوئی کس مجبوری اور بے بسی کے ساتھ اپنے پیاروں سے الگ ہوتا ہے۔ کوئی بھی پھول گچھے کو چھوڑنا نہیں چاہتا مگر اسے چھوڑنا پڑتا ہے۔''

خواتین اردو ادب میں ایک نئی اور چونکا دینے والی آواز **عصمت چغتائی** کی ہے۔ ان کی تحریریں بلاشبہ موضوعات اسلوب، کرداروں اور لب ولہجہ کے اعتبار سے تانیثی حسیت اور تانیثی شعور کے اظہار کا پہلا معتبر تجربہ ہیں۔ اس لحاظ سے ان کی تحریں تانیثیت کی پہلی اور مستند دستاویزات ہیں۔ عصمت چغتائی کے موضوعات بالکل منفرد ہیں۔ ان کے افسانوں اور ناولوں میں عورت کے جذبات ذہنی کیفیات، روزمرہ کی وارداتوں پر ان کے نفسیاتی ردِعمل اور ان کے مخصوص سماجی حالات کی عکس مندی فنکارانہ مہارت سے کی گئی ہے۔ انٹرویو میں کہتی ہیں:

> ''دوپہر کو محلے بھر کی عورتیں جمع ہو کر بیٹھ جاتی تھیں اور ہم لڑکیوں سے کہا جاتا تھا کہ ''چلو بھاگو تم لوگ'' میں چھپ کر پلنگ کے نیچے گھس کر کہیں سے ان کی باتیں سن لیا کرتی تھی۔ جنس کا موضوع گھٹے ہوئے ماحول اور پردے میں رہنے والی بیویوں کے بہت اہم قصے ہوتے، وہ اس پر بہت بات چیت کیا کرتی ہیں۔ میری ناول نگاری اسی گھٹے ہوئے ماحول کی عکاسی ہے۔''

آہستہ آہستہ وہ سماجی مسائل کی جانب متوجہ ہوئیں اس سلسلے میں ''جڑیں'' ایک اہم افسانہ ہے۔ اس میں عصمت چغتائی نے تقسیم ہند کے حالات و واقعات کو بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے متعدد افسانے ایسے ہیں جو سماج کے حقائق پر مبنی ہیں۔ ان میں افسانہ چھوئی موئی، چوتھی کا جوڑا، دو ہاتھ، چار پائی وغیرہ خاصے اہم ہیں اس کے علاوہ عصمت چغتائی نے تقریباً آٹھ ناول لکھے جن میں ضدی، ٹیڑھی لکیر، معصومہ، سودائی، عجیب آدمی، جنگلی کبوتر، دل کی دنیا اور قطرہ خون شامل ہے ان کی تخلیقی صلاحیت ناول اور افسانے میں نظر آتی ہے۔ ڈراموں میں بھی ان کی یکتائی کو محسوس کیا جا سکتا ہے ہر نئی تخلیق ایک نئے پیغام کے ساتھ آتی ہے جو دلوں کو جھنجھوڑتی چلی جاتی ہے ان کے ڈراموں میں فسادی، پردے کے پیچھے، سانپ، انتخاب، ڈھیٹ، پتے وغیرہ اہم ڈرامے ہیں۔ ان ڈراموں میں موضوع کے اعتبار سے منفرد اور لہجے کی تیز وطراری نے سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے عصمت اپنے افسانوں کی بنا پر بدنام بھی ہوئیں اور نام بھی کمایا۔

قرۃ العین حیدر اردو ادب کی کبھی نہ مکمل ہونے والی ایک عظیم داستان ہیں یہ نہ صرف ایک عظیم داستان بلکہ انتہائی معتبر اور توانا شخصیت ہیں ان کی تحریریں ادبی و فنی خوبیوں کے باعث دنیائے ادب کی ایک شاندار یادگار ہیں۔ ان کی شخصیت میں بے پناہ کشش تھی۔ نیک دل، روشن خیال، بے حد حساس اور شرافت و معصومیت اور شائستگی ان کی شرست میں داخل تھی۔ وہ خوش اخلاق اور خوش مزاج خاتون تھیں۔ ان تمام خوبیوں کی جھلک کہیں نہ کہیں ان کی تحریروں میں نظر آتی ہے۔

قرۃ العین حیدر کو کہانیاں، افسانے اور ناول لکھنے کا ذوق اپنے والد سے وراثت میں ملا تھا۔ ان کی شہرت کے سفر میں سجاد حیدر یلدرم اور نذر سجاد کا نام شامل ہے لیکن وقت کے ساتھ صورتِ حال میں تبدیلی آئی اور اب ان کے والدین کو بقائے دوام قرۃ العین حیدر کی وجہ سے حاصل ہوا۔

ان کی ادبی زندگی کی شروعات کہانی لکھنے کے ساتھ ہوئی اور یہ مانا جاتا ہے کہ پہلی کہانی ''کاٹھ گودام کا اسٹیشن'' انھوں نے چھ سال کی عمر میں لکھی۔ انھوں نے بچوں کے لیے بھی کہانیاں لکھی ہیں۔ ساقی، ہمایوں، ادب لطیف میں ان کی نگارشات مستقل شائع ہوئے۔ 1944 میں ان کا ایک اہم افسانوی مجموعہ 9 ناول اور 5 ناولٹ شائع ہوئے، افسانوی مجموعوں میں ستاروں سے آگے (1944)، شیشے کا گھر (1954)، پت جھڑ کی آواز (1966) اور روشنی کی رفتار (1982) آج بھی مقبول ہیں۔

1947 میں قرۃ العین حیدر نے اپنا ناول ''میرے بھی صنم خانے'' تحریر کیا۔ 1954 میں سفینۂ غم اور 1959 میں اردو کے افسانوی

ادب کا شاہکار ناول ''آگ کا دریا'' لکھا۔ان کے علاوہ بھی انھوں نے بہت سے ناول لکھے جن میں ''آخری شب کے ہم سفر'' (1979)، ''کارجہاں دراز ہے'' پہلا حصہ 1979 اور دوسرا حصہ (1990)، گردش رنگ چمن (1988) اور چاندنی بیگم 1989 وغیرہ شامل ہیں۔

ناول اور افسانے کے ساتھ ساتھ بہت سے ناولٹ بھی تحریر کیے جن میں سیتا ہرن، چائے کے باغ، دلربا، اگلے جنم موہے بٹیانہ کجیو، فصل گل آئی یا اجل آئی (1985) اور ہاؤسنگ سوسائٹی (1977) وغیرہ شامل ہیں۔

قرۃ العین حیدر نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں تقسیم ہند کے نتیجے میں پیدا ہونے والے تہذیبی و اخلاقی بحران اور ذہنی و قلبی انتشار کی بہت اثر انگیز عکاسی کی ہے۔انھیں اس تقسیم کے نتیجے میں برسوں کے قائم اور جمے جمائے خاندانوں کے بکھر جانے اور مسلمانوں کی برسوں پرانی تہذیبی وتمدنی روایات واقدار کے مٹ جانے کا شدّت کے ساتھ احساس تھا اور یہی احساس ان کی تخلیقات میں بنیادی اور کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔
دوسرے ادیبوں کی طرح ان کی نظر بھی اپنے ماحول اور زمانے اور حالات و واقعات اور مسائل اور معاملات پر تھی۔ مشرقی و مغربی ادب پر گہری نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ وہ تاریخ اور فلسفے سے بھی شناسائی رکھتی تھیں۔انھوں نے پہلی مرتبہ اردو کے افسانوی ادب میں شعور کی رو کا باقاعدہ کامیاب تجربہ کیا۔ان کے ناول اور افسانے پڑھتے وقت ہم ان کے کرداروں کے ساتھ ایک خاص زمانے کا تاریخی سفر کرنے لگتے ہیں۔آگ کا دریا، آخرشب کے ہم سفر اور گردش رنگ چمن ان تینوں بڑے ناولوں میں ماضی کا سفر حال کو روشن تر بناتا ہے۔تاریخی شعور انھیں ماضی پرستی سے بچاتا ہے۔

''دفعتاً ایک بھیانک دھماکہ ہوا اور سامنے کے اس رنگین سینما اسکوپ نظارے کے پرخچے اڑ گئے سیاہ دھواں اور سرخ شرارے ساری فضا میں رقصاں تھے بہت دور ایک مہیب جوالامکھی نے آگ اگلنا شروع کی ۔گرم گرم لاوا بہتا ہوا سارے میں پھیل گیا۔آتش فشاں کی گڑگڑاہٹ زلزلے کے دھاکوں آرکیٹا کے سروں، راک این رول کے شور، قہقہوں اور گلاسوں کی کھنکناہٹ میں سے گذرتی ایک مدھم، اداس خوبصورت آواز ثریا کے کانوں میں گونجتی ۔ماضی کی محل سرائیں جل کے راکھ ہوئیں مگر ابھی اس ملبے کے بنیادوں پر دونوں ملکوں میں بورژازی کے نئے محل کھڑے ہونگے، کل کے جاگیردار کی جگہ آج کا سرمایہ دار۔ثریا نے سہم کر آنکھیں بند کرلیں یہ بلجین کٹ گلاس کے فانوسوں سے جگمگاتا، اطالوی معمار بنایا ہوا الٹیرا ماڈرن جمشید ہاؤس نہیں تھا ۔ یہ ضلع سلطانپور کے تعلقے درگا کنڈ کی نیم تاریک گڑھی تھی جس میں وہ خود بسنتی بیگم قید تھی پھر درگا کنڈ کی گڑھی جمشید ہاؤس میں تبدیل ہوگئی، اس میں چھوٹی بٹیا قید تھی۔''

(ہاؤسنگ سوسائٹی)

حال سے ماضی میں چھلانگ لگانا اور ماضی کو حال کے تناظر میں دیکھنا قرۃ العین حیدر کا محبوب مشغلہ ہے اور وہ حال کو مستقبل سے جوڑنے کے فن میں بھی حاذق ہیں جس کی ایک تابناک مثال کا افسانہ 'روشنی کی رفتار' ہے۔

قرۃ العین حیدر کے افسانوں کا مطالعہ اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ ایک طرف تو ان طویل افسانے ناولٹ کی حدوں کو چھوتے ہیں اور دوسری طرف موصوفہ کا مختصر سے مختصر افسانہ بھی کم از کم بیس پچیس صفحات گھیرتا ہے جبکہ افسانے کے اختصار اور وحدت تاثر کی روایت شروع سے ہی بنیادی شرائط سے وابسطہ رہی ہے۔اسی طرح ان کے ناولوں نے عینی کو عظمت کی بلندیوں تک پہنچایا۔

حقیقت نگاری کے ترقی پسند رجحان سے وابستہ ہونے کے باوجود ان میں سے ہر ایک کے فنی اسلوب کی پہچان الگ کی جاسکتی ہے۔اس کے علاوہ ہاجرہ مسرور جنسی محرومیوں اور کمسنی کے جنسی تجربات کے اثرات کو باریکی سے دیکھتی ہیں تو دوسری طرف خدیجہ مستور نے اپنی شاہکار تخلیق ''آنگن'' میں تحریک آزادی کے آخری مرحلے کے پرآشوب دور کو ایک زمیندار گھرانے کے اسٹیج پر دیکھا اور اس کے کرداروں کو بے مثل فنی مہارت سے پیش کیا۔
جیلانی بانو کے افسانوں اور ناولوں میں فکری اور فنی رویوں کا جو تنوع اور وسعت ہے چند جملوں میں اس کا احاطہ ممکن نہیں ۔لہٰذا کہا جاسکتا ہے کہ خواتین نے اردو فکشن کی دنیا میں اہم رول ادا کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ پدر سری سماج میں خواتین کے ذریعے تخلیق کردہ ادب کو سراہا نہیں گیا اور نہ ہی ان کی حوصلہ افزائی کی گئی۔لیکن موجودہ صورت حال کا جائزہ لیا جائے آج خواتین بہت فعال ہوچکی ہیں۔

Sadia Parveen
A /163 3rd Floor ,Street No. 04
Johabai Extension
Batla House
Jamai Nagar, Okhla
New Delhi-110025

آفرین بیگم

خواتین تارکین وطن کارکن اور ان کے مسائل

خلاصہ: نقل مکانی ایک عالمی حقیقت ہے۔ انسان کئی وجوہات کو لے کر ایک مقام سے دوسرے مقام کو نقل مکانی کرتا ہے۔ نقل مکانی کی بڑی وجہ نوکری کی تلاش ہے۔ انسان اپنے آبائی جگہ پر مواقع کا نہ ہونے کی صورت میں نقل مکانی کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ جس میں خواتین مزدوروں کی بڑی تعداد شامل ہیں۔ خواتین مزدور اپنے خاندان کے افراد کے ساتھ نقل مکانی کرنے کے بعد غیر منظم شعبہ میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ہندوستان میں غیر منظم شعبہ میں کام کرنے والوں کی تعداد 92 فیصد ہے۔ کیونکہ غیر منظم شعبہ غیر ہنر مند، نیم ہنر مند افراد کو کام مہیا کرتا ہے۔ جس میں کثیر تعداد میں خواتین کارکن شامل ہیں۔ غیر منظم شعبوں میں تعمیراتی صنعت ایک ایسا شعبہ ہے جو خواتین مزدوروں کو اپنی طرف متوجہ کرواتا ہے۔ جس میں خواتین مزدور کم تنخواہ، طویل کام کے گھنٹے، ناقص صفائی، صحت کے مسائل وغیرہ کے ساتھ کام کرتی ہیں۔ اس مقالے میں خاص توجہ خواتین تارکین وطن تعمیراتی کارکن پر دی گئی اور یہ جاننے کی کوشش کی گئی کہ خواتین مزدوروں کو تعمیراتی سائٹ پر کس طرح کے مسائل درپیش ہوتے ہیں۔ ان مسائل سے نمٹنے کے لیے کن اقدامات کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اس مقالے کو ترتیب دینے کے لیے ثانوی مواد جیسے مقالے، کتابیں، رپورٹ کا استعمال کیا گیا ہے۔

تعارف: عالمی نقل مکانی ایک حقیقت ہے۔ چونکہ اصطلاح "ہجرت" کا اتنا وسیع مفہوم ہے۔ اس لیے بہت سے مختلف مفہوم اور تشریحات ہیں۔ جن کو مطالعہ یا بحث کی نوعیت، دائرہ کار یا مقاصد میں تغیرات سے منسوب کیا جاسکتا ہے۔ سماجیات کے محققین نے ہجرت کے سماجی اور ثقافتی اثرات پر توجہ مرکوز کی ہے۔ جغرافیہ دانوں نے ہجرت کی لمبائی، چوڑائی اور اہمیت پر زور دیا ہے، جب کہ ماہرین اقتصادیات نے ہجرت کے مالیاتی عناصر پر زور دیا ہے۔ اس کرہ ارض پر انسانی وجود کے پہلے دن سے ہی انسان اچھے ماحول میں رہنے کے لیے جگہ کی تلاش میں جگہ جگہ گھوم رہا ہے۔ (Keerthiga & Selvam, 2017) نقل مکانی لوگوں کو مختلف انداز میں سوچنے اور زیادہ مسائل سے مبرا عام زندگی گزارنے کا سبب بنتی ہے۔ دنیا کے مختلف خطوں میں رہنے والے اپنے سابقہ تجربات کی بنیاد پر نقل مکانی کرتے ہیں۔ نقل مکانی کسی بھی مقام پر آبادی کی توسیع کے تین ضروری اجزاء میں سے ایک ہے۔ باقی دو شرح پیدائش اور شرح اموات ہیں۔ تاہم، ہجرت حیاتیاتی فریم ورک کے اندر کام نہیں کرتی ہے۔ جب کہ شرح پیدائش اور شرح اموات ہوتی ہیں۔ اس

کا اثر آبادی کے سائز، ساخت اور تقسیم پر پڑتا ہے۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ نقل مکانی کا لوگوں کی سماجی، سیاسی اور معاشی زندگیوں پر اثر پڑتا ہے۔ لوگ اس وقت ہجرت کرتے ہیں جب وہ ایک مستقل جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے ہیں جو کہ ایک طویل مدت میں کم و بیش مستقل ہوتا ہے۔ (Singh, 2011Kaur, Singh, Garg, Singh, &)

آج کل، تعمیراتی صنعت دیہی علاقوں سے نقل مکانی کرنے والوں کو شہروں میں داخل ہونے میں مدد دے رہی ہے۔ نتیجے کے طور پر، تارکین وطن تعمیراتی صنعت کی افرادی قوت کا بڑا حصہ بناتے ہیں۔ تعمیراتی شعبے میں مہاجر مزدوروں کا استعمال کوئی نئی بات نہیں ہے۔ تعمیراتی ملازمتیں روایتی طور پر اقتصادی ترقی کے عمل کے دوران دیہی علاقوں سے تارکین وطن کارکنوں کے لیے لیبر فورس میں داخلے کا ایک نقطہ ہیں۔ ان لوگوں کے لیے جن کی کوئی خاص مہارت یا تعلیم نہیں ہے۔ تعمیراتی کام اکثر کھیت کے کام کا واحد بامعنی متبادل ہوتا ہے۔ اور یہ خاص طور پر بے زمین لوگوں کے لیے بہت اہم ہے۔ چونکہ ہندوستان میں مزدوری بہت سستی ہے اس لیے تعمیراتی صنعت میں بہت زیادہ مزدوروں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ 2011 کی مردم شماری کے مطابق 314 ملین تارکین وطن کارکن موجود ہے اور ان میں 268 ملین ایک ریاست سے دوسری ریاست میں ہجرت کر گئے اور 41 ملین بین ریاستی تارکین وطن ہے۔ 5.1 ملین ملک سے باہر سے ہجرت کر گئے اور جائے پیدائش کے لحاظ سے کل ہجرت کرنے والوں کی تعداد 1028610328 تھی۔ ایک اندازے کے مطابق اس وقت تقریباً 80 ملین تارکین وطن ہیں جن میں سے 40 ملین تعمیراتی صنعت سے وابستہ ہیں۔

خواتین زیادہ تر غیر ہنر مند مزدور ہیں جو کام سے متعلق بڑے مسائل کا شکار ہوتی ہیں۔ جیسے اجرت میں امتیاز، صنفی اور جنسی طور پر ہراساں کرنا، کام کے خراب تعلقات، اور کم اجرت اس کے باوجود تعمیراتی شعبے میں خواتین کارکنوں کی ایک بڑی تعداد ہے۔ ان کی صلاحیتوں کو کبھی بھی اپ گریڈ نہیں کیا جاتا ہے کیونکہ خواتین کو صرف خاص قسم کے کام کرنے کی اجازت ہے اور عام طور پر مرد لیبر فورس کی مدد کرتے ہیں۔ ہندوستان دنیا کی تیزی سے پھیلتی ہوئی معیشتوں میں سے ایک ہے۔ حکومت ہند نے ملک کی اقتصادی ترقی کے لیے بنیادی ڈھانچے کی ترقی کو فروغ دینے کے لیے متعدد پروگرام نافذ کیے ہیں۔ تعمیراتی صنعت ہندوستانی معیشت کی عالمگیریت کی کامیابی کے لیے اہم ہے۔ تعمیراتی صنعت عالمی افرادی قوت کا 7% کام کرتی ہے۔ آج، ہندوستانی تعمیراتی صنعت تقریباً 31 ملین افراد کو ملازمت دیتی ہے اور ہر سال 200,000 ملین روپے سے زیادہ کے اثاثے پیدا کرتی ہے۔ یہ زرعی شعبے کے بعد ہندوستان میں غیر منظم مزدوروں کی دوسرا سب سے بڑی اجرت ہے۔ 2006-07 میں ہندوستان میں فیکٹری لاگت پر GDP میں تعمیراتی سیکٹر کا حصہ 1,965,550 روپے تھا۔ پچھلے سال کے مقابلے میں 10.7 فیصد کا اضافہ، اور تعمیراتی شعبے کا جی ڈی پی میں حصہ 2002-03 میں 6.1 فیصد سے بڑھ کر 2006-07 میں 6.9 فیصد ہو گیا۔ تعمیراتی کارکن معاشی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ وہ صنعتی ترقی کے لیے درکار بنیادی ڈھانچے کی تعمیر کرتے ہیں۔ یہ وہی ہیں جو عالمگیر معیشت میں نئی معیشت کی تعمیر کر رہے ہیں۔ ہندوستان میں تین کروڑ تعمیراتی کارکن عملی طور پر عصری ہندوستان کے معمار ہیں۔ وہ سڑکوں اور شاہراہوں، ریلوے ٹریکس، ہوائی اڈوں اور بندرگاہوں، آئی ٹی شہروں، رابطہ مراکز اور میگا مالز کی تعمیر کے ذریعے ہندوستان کے بنیادی ڈھانچے کی ترقی میں حصہ ڈالتے ہیں، جو آج دولت کی نئی شکلیں بنا رہے ہیں۔ (Kiran, 2013devi &)

ادب کا جائزہ

(Nivedita Jayaram 2019) اس تحقیق میں، تارکین وطن خواتین جو کہ تعمیراتی صنعت میں مزدور ہیں ان کو شامل کیا گیا ہے۔ یہ مقالہ آجیویکا بیورو تنظیم کی مدد سے مرتب کیا گیا ہے جو مہاجر مزدوروں کے لیے کام کرتی ہے۔ جن میں BHIL آدیواسی خواتین بھی مزدوری کا کام کرتی ہیں۔ یہ مقالہ خواتین کارکنوں کی عدم مساوات اور اخراج، خواتین کارکنوں کو درپیش مسائل جیسے کہ تعمیراتی صنعت میں کام کرنے کا تجربہ، پانی، صفائی، کام کا تسلسل، تعمیراتی جگہوں پر رہنا، صحت اور بچوں کی دیکھ بھال پر توجہ دیتا ہے۔ حکومت کی دیکھ بھال اور ناکامی کے بارے میں تفصیل سے لکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس مقالے کو ترتیب دینے کے لیے مختلف تحقیقی طریقے استعمال کیے گئے ہیں۔ کل 100 خواتین تارکین وطن تعمیراتی کارکنوں سے انٹرویو، نیم ساختہ انٹرویو، اور غیر شریک مشاہدہ وغیرہ کے ذریعے ڈیٹا اکٹھا کیا گیا ہے۔ نیز صنفی بوجھ کے تصور کا استعمال کرتے ہوئے خواتین کارکنوں سے ان کے دیگر کام کے بوجھ کے بارے میں تفصیل سے پوچھا گیا ہے۔

(2021Manjunath S) اس مقالے میں، تعمیراتی جگہ پر درپیش مسائل کا تفصیلی مطالعہ کیا گیا ہے۔ جس میں خواتین تارکین وطن تعمیراتی کارکنوں اور ان کے بچوں پر پڑنے والے اثرات کو بیان کیا گیا ہے۔ اس مقالے میں بچوں کی تعلیم، حکومتی اقدامات تک رسائی، صحت اور

صفائی وغیرہ کا مطالعہ کیا گیا ہے۔اس مقالے کی تیاری کے لیے مختلف تحقیقی طریقے استعمال کیے گئے ہیں۔تعمیراتی صنعت میں کام کرنے والے دوسو کارکنوں کو بھرتی کیا گیا اور وضاحتی تجزیہ اور ترتیب وار سوالنامے کا استعمال کرتے ہوئے ڈیٹا اکٹھا کیا گیا۔اور تحقیقی تجزیہ کے لیے ANOVA، Chi-square، Factor Analysis اور Weight Average Analysis استعمال کیا گیا۔آخر میں اس مقالے سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ مہاجر خواتین تعمیراتی کارکنوں اور ان کے بچوں کے لیے کوئی سہولیات دستیاب نہیں ہیں۔نقل مکانی کرنے والی خواتین تعمیراتی کارکن اپنی شہری زندگی میں کافی مشکلات کا سامنا کرنے پر مجبور ہیں۔

(Kalpana 2013) یہ مضمون ہندوستان میں تعمیراتی صنعت میں کام کرنے والی خواتین کارکنوں کی حیثیت کو بیان کرتا ہے۔خاص طور پر تعمیراتی صنعت میں درپیش مسائل کا جائزہ،خواتین کارکنوں کو بہتر ماحول فراہم کرنے کے طریقے کی تجویز کرتا ہے۔اس لیے موجودہ لٹریچر کا جائزہ لے کر کچھ اہم نکات پر مقالہ لکھا گیا۔یہ مضمون ہندوستان میں تعمیراتی صنعت میں کام کرنے والی خواتین کارکنوں کی حیثیت کو بیان کرتا ہے۔خاص طور پر تعمیراتی صنعت کے مسائل کا جائزہ لے کر،خواتین کارکنوں کو بہتر ماحول فراہم کرنے کے طریقے کو تجویز کرتا ہے۔جیسا کہ اجرت کی تفریق،جنسی ہراسانی،صنفی تعصب اور سماجی تعلیم کے رابطے وغیرہ شامل کیے گئے ہیں۔آخر میں،مقالے سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ خواتین کارکنوں کو درپیش مسائل کو کم کرنے کے لیے حکومت کی طرف سے فراہم کردہ پالیسی پر سختی سے عمل درآمد کیا جانا چاہیے۔جس سے ورکرز کو کام کرنے کا بہتر ماحول مل سکتا ہے۔

(Abdul Azeez 2021) اس مقالے میں غیر رسمی شعبے میں کام کرنے والی تارکین وطن خواتین پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے کووڈ19 کے دوران پیش آنے والی مشکلات کا جائزہ لیا گیا ہے۔اس تحقیق کے لیے دہلی اور ہریانہ ریاست کا انتخاب کیا گیا جہاں تقریباً مہاجر مزدور مختلف وجوہات کی بنا پر دوسری ریاستوں سے ہجرت کر کے اپنی روزمرہ کی زندگی گزارتے ہیں۔گزشتہ برسوں میں دنیا بھر میں COVID-19 کی بیماری کے پھیلاؤ نے ہر ایک کو کئی طریقوں سے متاثر کیا ہے۔خاص طور پر خواتین تارکین وطن کارکنوں کو جنھیں کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔جیسے روزی روٹی،سمجھوتوں کا نقصان،ذمہ داری کا بوجھ،کووڈ19 کا جذباتی جغرافیہ،ناکافی مدد وغیرہ اس مطالعہ میں شامل ہیں۔فون پر انٹرویوز کے ذریعہ تحقیق کی گئی اور آخر کار یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ حکومت کو جلد از جلد پالیسی مداخلت کی ضرورت ہے۔اس کی وجہ سے مہاجر مزدوروں کو کچھ حد تک مدد مل سکتی ہے۔

(Ray Saraswati 201) یہ رپورٹ ہندوستان میں مہاجر خواتین کا مطالعہ کرتی ہے۔جس میں دہلی اور ممبئی میں موجود خواتین تارکین وطن کارکن کو لیا گیا۔اس رپورٹ میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ خواتین کی نقل مکانی کی وجہ صرف شادی ہی نہیں بلکہ سماجی و اقتصادی وجوہات کی بنا پر بھی خواتین ایک ریاست سے دوسری ریاست میں ہجرت کر رہی ہیں۔رپورٹ میں دہلی اور ممبئی میں مہاجر خواتین کا احاطہ کیا گیا تھا۔دہلی کے 409 تارکین وطن کارکنوں اور ممبئی کے 501 تارکین وطن کارکنوں نے اس رپورٹ کا جواب دیا۔اس رپورٹ کے لیے تحقیقی مطالعہ کرتے ہوئے،پہلی وجہ ہجرت کی سب سے بڑی وجہ ہے،دوسری وجہ ہندوستان میں تارکین وطن خواتین کی سماجی،معاشی اور صحت سے متعلق کمزوری ہے۔مواد کو سوالنامے کے ذریعے جمع کیا گیا۔آخر میں اس رپورٹ کے ذریعے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ ہندوستان میں داخلی خواتین تارکین وطن کو کافی مشکلات کا سامنا ہے۔جس کی وجہ سے وہ اپنی حالت بہتر نہیں کر پا رہی ہیں۔یہ رپورٹ تارکین وطن خواتین کارکنوں کی اپنی سماجی،اقتصادی اور صحت سے متعلق معلومات کو برقرار رکھنے اور حکومت کی طرف سے فراہم کردہ اسکیم سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی ضرورت کو اجاگر کرتی ہے۔

(Dhivya 2017) اس مقالے میں خواتین تارکین وطن تعمیراتی کارکنوں کو درپیش صحت کے مسائل پر توجہ مرکوز کی گئی۔جس میں بتایا گیا کہ زراعت کے بعد تعمیراتی صنعت غیر ہنرمند اور نیم ہنرمند کارکنوں کے لیے روزگار کا بڑا ذریعہ ہے۔اس کی بنیادی وجہ تعلیم کی کمی بتائی گئی ہے۔اس کے ساتھ اس مقالے میں ہجرت کی تاریخ،ہجرت کی وجوہات اور ہجرت کے بعد کے مسائل کا جائزہ لیا گیا ہے۔اس مقالے کا مطالعہ چار اہم وجوہات کی بنا پر کیا گیا: پہلی،سماجی اقتصادی اور آبادیاتی پس منظر،خواتین کارکنوں کی تنخواہ،ہجرت کی وجوہات،صحت کے مسائل وغیرہ۔سادہ بے ترتیب نمونوں کا استعمال کرتے ہوئے سوالنامے کے ذریعے 75 جواب دہندگان سے مواد اکٹھا کیا گیا۔خواتین کی صحت کے مسائل پر خصوصی توجہ دی گئی اور سوشل سیکیورٹی میجرز کی بیداری کی سطح کا بھی مطالعہ کیا گیا۔

(Apoorva Bhatia 2021) اس رپورٹ میں مہاجر مزدور کی صحت،حفظان صحت اور غذائیت کی کیفیت کا تفصیل سے مطالعہ کیا گیا ہے۔مہاجر مزدوروں کو جو خاص طور پر ریاست ہماچل پردیش سے تعلق رکھتے ہیں ان کو اس رپورٹ میں شامل کیا گیا ہے۔مہاجر کارکنوں پر

توجہ مرکوز کرنے کے لیے مردم شماری اور NSSO کے ڈیٹا کا استعمال کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ مستقل ہجرت، موسمی ہجرت، factors pull اور push بھی شامل تھے۔ اجرت میں امتیازی سلوک، جنسی ہراسانی، چائلڈ لیبر، غذائیت کی کمی اور کام کے خطرناک حالات وغیرہ میں تارکین وطن کارکنوں کی کمزوریوں اور خطرات کا تفصیل سے مطالعہ کیا گیا۔

(Usmila Yadav 2022) اس مضمون میں مہاجر خواتین کارکنوں پر ایک مطالعہ کیا گیا ہے جو کووڈ19 کے دوران اپنی جگہ پر واپس ہجرت کر گئیں۔ ہجرت کے بعد ہونے والے مسائل پر خصوصی توجہ دی گئی۔ اس کے ساتھ غیر ہنر مند سطح پر کام کرنے والے مرد اور خواتین کارکنوں کو درپیش مسائل کا مطالعہ کیا گیا۔ تحقیق کے طریقہ کار میں، اتر پردیش کی تین تحصیلوں میں مہاجر خواتین پر Exploratory تحقیق کے ذریعے 333 کارکنوں کا پتہ لگا کر مطالعہ کیا گیا۔ اس تحقیق کے ذریعے یہ بات سامنے آئی ہے کہ تقریباً تمام خواتین ورکرز کم تنخواہ پر، سوشل سیکیورٹی کے بغیر، اور کام کرنے کے ناقص حالات میں کام کرنے پر مجبور ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ تعلیم کا فقدان ہے جس کی وجہ سے خواتین ورکرز غیر ہنر مند مزدور کے طور پر کام کرنے پر مجبور ہیں۔

(Arpita Banerjee 2009) یہ مقالہ خواتین تارکین وطن کارکنوں کی صنفی نقل وحرکت اور ہندوستان میں شہری زندگی کے ساتھ ساتھ شہری کام کو بھی دریافت کرتا ہے۔ خواتین کارکنوں کے بدلتے پروفائل اور موجودہ مواقع پر توجہ دیتے ہوئے مرد اور خواتین کارکنوں سے متعلق ہر پہلو جیسے غربت، تعلیم، شادی، کام وغیرہ کا مطالعہ کیا گیا۔ اس مقالے میں تارکین وطن کارکنوں کے دو گروپ شامل تھے۔ پہلا، وہ خواتین جو ہجرت کے بعد پہلے سے کام کر رہی تھیں اور دوسری، وہ خواتین کارکن جو ہجرت کے بعد پہلی بار مارکیٹ میں داخل ہوئیں۔ اس مقالے کو تیار کرنے کے لیے 55ویں این ایس ایس کے ڈیٹا کا باریک بینی سے جائزہ لے کر تارکین وطن خواتین کارکنوں کے کام کی حالت جاننے کی کوشش کی گئی ہے۔

(Ritu Singh 2019) خواتین کارکنوں کی صحت کی صورتحال کا مطالعہ کیا گیا جس میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی کہ مہاجر خواتین ورکرز کی ایک بڑی تعداد غیر منظم شعبے میں کام کرتی ہے۔ اس غیر منظم شعبے میں کام کرنے والے مزدوروں کو درپیش مسائل بالخصوص خواتین کو درپیش مسائل کا جائزہ لیا گیا۔ اس تحقیق کے لیے 40 خواتین ورکرز سے Snowball Sampling کے ذریعے ڈیٹا اکٹھا کیا گیا اور تحقیق کو وضاحتی ڈیزائن Descriptive design کے ذریعے پیش کیا گیا۔ آخر میں بتایا گیا کہ برطرفی کے علم کی وجہ سے خواتین ورکرز کا ہر طرح سے استحصال کیا جاتا ہے اور اس تحقیق میں کہا گیا کہ انسانی صحت بنیادی انسانی حق ہے۔ صحت مند ہونا ایک اچھی علامت ہے۔ ایک صحت مند شخص اپنی توانائی کا استعمال کرتے ہوئے بہتر کام کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ خواتین کا صحت مند ہونا خاص طور پر ضروری ہے۔ ہجرت کے بعد خواتین اپنی صحت کے بارے میں آگاہ نہیں ہیں۔ حکومت خواتین ورکرز کی صحت کے لیے اسکیموں پر عملدرآمد کرے۔

(Rasheedha Banu 2018) اس مقالے میں خواتین تعمیراتی کارکنوں کی صحت پر تحقیق کی گئی جس میں بتایا گیا کہ تعمیراتی شعبے میں کام کرنے والی خواتین کو غیر ہنر مند مزدوروں کے طور پر جوائن کیا جاتا ہے اور کئی سالوں تک کام کرنے کے بعد بھی ان کی اجرت اور ہنر میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ تعمیراتی شعبے میں کام کرنے والی خواتین کی صحت کا جائزہ لیا گیا جس میں Snowball Sampling کی مدد سے 476 خواتین کے انٹرویو کیے گئے اور ان کے صحت کے مسائل کا مطالعہ کیا گیا۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ پیشاب کی نالی میں انفیکشن، جلد کی الرجی اور پھیپھڑوں کے مسائل خواتین کنکشن ورکرز کو ہونے والی عام بیماریاں ہیں۔ خواتین کارکنوں میں یہ بات پائی گئی اور کہا گیا کہ حکومت کو ان خطرات سے بچانے کے لیے بہتر پالیسی لانے اور اس پالیسی پر عمل درآمد کرنے کی ضرورت ہے۔

خواتین تارکین وطن تعمیراتی کارکنوں کو درپیش مسائل:

خواتین تارکین وطن تعمیراتی کارکنوں کے مسائل کو کئی قابل پیائش حالات میں درجہ بندی کی جا سکتی ہے۔ حالیہ تحقیقی ادب کے مطابق، سرفہرست خدشات میں شامل ہیں۔

اجرت میں امتیاز

بنیادی اقتصادی اصلاحات، اقتصادی کشادگی، اور انسانی نقل و حرکت میں اضافہ کے نتیجے میں، ایشیا اور بحرالکاہل کا خطہ کلاسک قسم کے امتیازی سلوک کا سامنا کر رہا ہے جیسے کہ صنفی اور نسلی بنیادوں پر، نیز نئی قسم کے تعصبات پر اثر ہوا۔ خطے میں تارکین وطن کارکنوں کی بڑھتی ہوئی آبادی کو نئی قسم کے تعصبات کا سامنا ہے۔ کم تنخواہ، طویل مزدوری کے اوقات، اور تشدد یہ سب نسلی امتیاز، xenophobia اور عدم برداشت کے مظہر ہیں۔ چونکہ وہ اکثر تعمیرات یا سیاحت جیسی صنعتوں میں کام کرتے ہیں جو اکثر معاشی بدحالی کے ابتدائی اثرات کا سامنا کرتے ہیں۔ اس لیے مہاجر

کارکنان ان حالات سے سب سے زیادہ متاثر ہونے والوں میں شامل ہیں۔معیشت کے غیر منظّم شعبے میں خواتین مردوں کے مقابلے کم کماتی ہیں۔ یہاں تک کہ روزگار کی دستیابی میں بھی اتار چڑھاؤ آتا ہے۔ جب ان خواتین کو ملازمت ملتی ہے تو وہ اکثر معمولی تنخواہ کے لیے لمبے گھنٹے لگاتی ہیں اور کبھی کبھار ان کی محنت کے مطابق تنخواہ نہیں ملتی۔

جنسی طور پر ہراساں

ایک اور بڑا مسئلہ جنس کی بنیاد پر تشدد ہے۔ کیونکہ یہ خواتین خاص طور پر ایجنٹوں اور ٹھیکیداروں کے ہاتھوں جنسی ہراسانی اور بدسلوکی کا شکار ہوتی ہیں۔ اس لیے خواتین ملازمین کام کی جگہ پر آرام دہ محسوس نہیں کرتی۔ اس کمیونٹی میں صنفی امتیاز اور جنسی ہراسانی بہت زیادہ ہے۔ تعلیم کی کمی کی وجہ سے خواتین کی اکثریت ہراساں کرنے اور استحصال کا نشانہ بنتی ہے۔ ریاست اور وفاقی نفاذ کی عمومی کمی کی وجہ سے اس وقت متعدد قوانین کو توڑا جا رہا ہے۔ غربت کی وجہ سے تارکین وطن خواتین کو اپنی Destination پر جنسی کام کرنے پر مجبور ہوتی ہیں۔

کام کرنے کے خطرناک حالات

خواتین تارکین وطن مزدور کام کرنے اور نامساعد حالات میں زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ کیونکہ یہ خواتین اپنے حقوق کے لیے سودے بازی نہیں کر پاتی، اس لیے ان کا استحصال کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر غیر منظّم شعبے میں خواتین ورکرز کو کم از کم اجرت کے قوانین یا فیکٹری ایکٹ سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ ٹھیکیدار کوئی حفاظتی سامان فراہم نہیں کرتے جیسے ماسک، ہیلمٹ وغیرہ۔ تعمیراتی مقامات پر پینے کے صاف پانی کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ صفائی ستھرائی اور حفظان صحت ناقص ہے، اور کوئی فعال بیت الخلاء فراہم نہیں کیے گئے ہیں۔ خواتین کے لیے حفظان صحت کا سامان نایاب یا ممنوعہ طور پر مہنگا ہے۔ جب خواتین کو ماہواری ہوتی ہے تو انھیں مرد سپروائزر سے چھٹی مانگنے میں شرمندگی ہوتی ہے کیونکہ سائٹس پر کوئی خاتون سپروائزر نہیں ہوتی۔ بہت سی حاملہ خواتین اپنے حمل کے کم از کم چھ ماہ تک کام کرتی رہتی ہیں، اور ایسا کرنے کے لیے ان کے مالکان کی طرف سے بہت کم دباؤ ہوتا ہے۔ چونکہ خواتین اپنی اضافی آمدنی کو کھونا نہیں چاہتیں، وہ اس وقت تک کام کرتی رہتی ہیں جب تک کہ وہ اپنا کام پورا نہ کرلیں۔

شناخت کے بحران کی وجہ سے مسائل:

جب تارکین وطن ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے ہیں تو ان کے لیے شناختی دستاویزات جیسے راشن کارڈ، ووٹر کارڈ وغیرہ حاصل کرنا مشکل ہوتا ہے۔ نئے ملک میں پہنچنے پر بے سہارا تارکین وطن کو درپیش سب سے اہم مشکلات میں سے ایک ان کی شناخت ثابت کرنا ہے۔ غربت کی شرح سے نیچے زندگی گزارنے والے لوگوں کو راشن کارڈ دیے جاتے ہیں۔ جو انھیں راشن کی دکانوں سے بہت کم قیمتوں پر اناج اور دیگر ضروریات جیسے پیرافین خریدنے کی اجازت دیتے ہیں۔ تاہم، ایک بار جب وہ ہجرت کر لیتے ہیں، تو ان کے لیے اس جگہ کے لیے نیا راشن کارڈ حاصل کرنا انتہائی مشکل ہوتا ہے کیونکہ وہ اس کارڈ کو استعمال نہیں کر سکتے جو وہ پہلے استعمال کر رہے تھے۔ نتیجے کے طور پر، راشن کی قیمت میں کمی واقع ہو جاتی ہے، اور دیگر چیزوں کے علاوہ عوامی خدمات جیسے ہسپتال، تعلیم اور دیکھ بھال تک رسائی کے لیے شناخت کے ثبوت کے طور پر راشن کارڈ کی ضرورت ہوتی ہے۔

صحت کی خراب صورتحال:

متعدد عوامل تارکین وطن کی صحت پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ بشمول ان کی اصل جگہ، حمل و نقل اور منزل کا صحت کا ماحول، سفر کے حالات، پینے کے پانی کی دستیابی اور بنیادی سہولیات، اور خوراک اور غذائیت کی مقدار۔ نقل مکانی کرنے والوں کو ان کی منزل پر صحت کے خطرات لاحق ہوتے ہیں۔ جن میں ملیریا اور تپ دق جیسی متعدد بیماریاں، نیز پیشہ ورانہ صحت کے خطرات جیسے سانس کے مسائل، پھیپھڑوں کے امراض، الرجی، گردے اور مثانے کے انفیکشن، کمر کے مسائل، اور غذائی قلت شامل ہیں۔ تارکین وطن کام کے دوران اکثر زخمی ہو جاتے ہیں۔ پھر بھی انھیں کوئی طبی امداد یا معاوضہ نہیں ملتا۔ نقل مکانی کرنے والی خواتین مزدوروں کو تولیدی اور پیشہ ورانہ صحت کے متعدد مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ خواتین بھی، تین گنا زیادہ کام برداشت کرتی ہیں۔ تولیدی، پیداواری، اور گھریلو۔ ان خواتین میں غذائیت کی کمی، خون کی کمی، گھر کی ذمہ داریاں، اور پانی اور باتھ روم جیسی بنیادی سہولیات کی کمی ہے۔ جو ان کی خراب صحت کا باعث بنتی ہے۔ غیر منظّم شعبے میں خواتین ورکرز کو دیگر چیزوں کے علاوہ امراض نسواں کے مسائل، اسقاط حمل، اور قبل از پیدائش کا سامنا کرنا پڑا۔ جس نے ان کی کام کی زندگی کو متاثر کیا۔ کم عمری کی شادیوں (13-18 سال)، ابتدائی حمل (15-17 سال)، تربیت یافتہ برتھ اٹینڈنٹ کے بغیر جنم دینا، بار بار ولادت، مسلسل بچے کی پیدائش کے بعد خراب صحت کی وجہ سے ماؤں اور بچے کی صحت خراب رہتی ہے۔ ہندوستان میں بچوں کے بالغ ہونے سے پہلے شادی پر پابندی کے قانون (2006) کے وجود کے باوجود، کم عمری کی شادیاں جاری رہتی ہیں۔ جو اکثر خراب صحت، غذائیت کی کمی، اور سٹنٹنگ کے ساتھ ساتھ نوجوان لڑکیوں کو تعلیم سے محروم کرنے کا باعث بنتی ہیں۔

نتیجہ

اس مقالے کے ذریعہ یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ خواتین تارکین وطن تعمیراتی کارکن کو تعمیراتی سائٹ پر کئی مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جیسے اجرت میں امتیاز، جنسی طور پر ہراساں، کام کرنے کے خطرناک حالات، صحت کی خراب صورتحال وغیرہ۔ ان مسائل کے باوجود بھی خواتین تعمیراتی کارکن کام کرنے پر مجبور ہیں۔ تعلیم کا نہ ہونا، خواتین مزدوروں کو غیر ہنرمند مزدور کی طرح کام کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ تعمیراتی صنعت میں لمبے عرصے تک کام کرنے کے باوجود بھی خواتین مزدوروں کی اجرت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ خواتین مزدور مرد مزدور کے تابع ہو کر کام کرتی ہیں۔ ہندوستان میں تعمیراتی صنعت میں کام کرنے والی خواتین مزدوروں کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ جس کی اہم وجہ تعلیم کا نہ ہونا ہے۔ جس کی وجہ سے خواتین مزدور اپنے حقوق سے ناواقف ہیں۔ خواتین تارکین وطن مزدوروں کے تحفظ کے لیے ضروری اقدامات کیے جانے چاہیے۔

References

Banu, S., & S.Sampathkumar. (2018). HEALTH ISSUES OF WOMEN CONSTRUCTION WORKERS: AN EVIDENCE FROM TRICHIRAPPALLI, TAMILNADU. Indian Journal Of Applies Research.

Bhatia, A., Agarwal, P., Neena, E., Mehla, A., & Makhijani, N. (2016). Assessment of Health, Hygiene and Nutritional status of Migrant Labourers:Scientific Intervention and CommunityParticipation.

Carballo, M., & Nerukar, A. (2001). Migration, Refugees, and Health Risks. Centre for Migration and Health, Vernier, Switzerland. SwitzerLand.

DALMIA, A. J. (2012). Strong Women, Weak Bodies, Muted Voices: Women Construction Workers in Delhi. Economic and Political Weekly.

Desari, K., & C B, R. K. (2016). A Study on Construction Labour Productivity Parameters in India. Journal of Construction Engineering, Technology and Management.

devi, K., & Kiran, U. (2013). Status of Female Workers in Construction Industry in India: A Review. IOSR Journal Of Humanities And Social Science.

Kaur, B., Singh, J., Garg, B., Singh, J., & Singh, S. (2011). Causes and Impact of Labour Migration: A Case Studyof Punjab Agriculture. Agricultural Economics Research Review.

Keerthiga, V. D., & Selvam, D. A. (2017). A Study on Health Problems among Women Migrant Construction Workers. INTERNATIONAL JOURNAL FOR INNOVATIVE RESEARCH IN MULTIDISCIPLINARY FIELD.

Raju, A. B. (2009). Gendered Mobility: Women Migrants and Work in Urban India. Economic and Political Weekly.

Ravindranath, D. (2019). Maternal Health and Access to Healthcare among Migrant Workers Engaged in Informal ConstructionWork, Ahmedabad, India. Research square.

S., M., Kumar, S. M., & A, M. (2021). Literacy and Liv acy and Livelihood of W elihood of Women Migr omen Migrant Construction W ant Construction Workers: An Analytical Study. Journal of International Women's Studies.

Singh, R. (2019). Health Problems of Migrant Women Labourers:A Study of SAS Nagar (Mohali). Journal of Advances and Scholarly Researches in Allied Education.

SOUNDARARAJAN, V. (2013). Construction Workers: Amending the Law for More Safety. Economic And Political Weekly.

Yadav, D. U. (2022). Unskilled Migrant Women Labour during Locked down: A SocioEconomic perspective. Journal of Positive School Psychology.

❐❐❐

Afreen Begum

Reserach Scholar

MANUU, Gachi Bowli

Hyderabad-500032 (T.S)

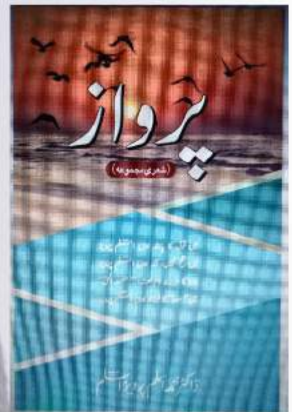

شاہینہ پروین

ڈاکٹر محمد اسلم پرویز کی شخصی رباعیات کا تنقیدی جائزہ

رباعی عربی لفظ رباع سے مشتق ہے، جس کے معنی چار چار کے ہیں۔ چوں کہ یہ چار مصرعوں یا دو بیتوں پر مشتمل ہوتی ہے اس لیے رباعی کہلائی۔ قدیم زمانے میں اسے مختلف ناموں جیسے ترانہ، دوبیتی، چہار بیتی بھی کہا جاتا تھا اور ہندی میں اسے چوپائی یا چوبولا جاتا ہے۔ اصطلاح میں رباعی اس مختصر نظم کو کہتے ہیں جو چار مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے جس کے پہلے، دوسرے اور چوتھے مصرعے مقفی اور مردف ہوتے ہیں جسے خصی کہا جاتا ہے جو مخصوص اوزان میں لکھی جاتی ہے، جبکہ تیسرا مصرع غیر مقفی ہوتا ہے اور تیسرے مصرع میں قافیہ لایا جائے تو کوئی عیب بھی نہیں۔

بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری:

’’رباعی شاعرانہ اصطلاح میں اس صنف کا نام ہے جس کے چاروں مصرعوں میں ایک مکمل مضمون ادا کیا جاتا ہے۔ بقول فرمان فتح پوری

رباعی کا وزن مخصوص ہے، پہلے، دوسرے اور چوتھے مصرع میں قافیہ لانا ضروری ہے۔ تیسرے مصرع میں اگر قافیہ لایا جائے تو کوئی عیب نہیں۔ اردو فارسی کے شعراء نے ہر قسم کے خیال کو نظم کیا ہے، اس لیے اس کے موضوعات کا تعین نہیں۔ رباعی کے آخری دو مصروں بالخصوص چوتھے مصرع پر پوری رباعی کے حسن و اثر اور زور کا دارومدار ہے۔ چنانچہ علمائے ادب اور فصحائے سخن نے ان اُمور کو ضروری قرار دیا ہے۔"

(اردو شاعری کا فنی ارتقاء، از فرمان فتح پوری)

مذکورہ بالا اقتباس کی روشنی میں ہم یہ کہ سکتے ہیں کہ رباعی کے لیے بحر ہزج میں ہونا لازمی ہے، پہلا، دوسرا، اور چوتھا مصرع ہم قافیہ و ہم ردیف ہو، ان مخصوص اوزان و عروض کی پابندی کے بغیر رباعی معرضِ وجود میں نہیں آسکتی ہے، چوں کہ تمام اصناف سخن میں رباعی لکھنا نہایت مشکل اور نہایت لیاقت کا کام ہے۔ جس کے لیے استادانہ مہارت کی اشد ضرورت ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ نومشق شعراء اس میدان میں قدم رکھنے سے گریز کرتے ہیں۔ لیکن بیدل عظیم آبادی کی سرزمین کا ایک اہم اور نمایاں نام ڈاکٹر محمد اسلم پرویز اسلم (بھاگلپور) کا ہے۔ یوں تو انھوں نے تقریباً تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی لیکن شعرگوئی کے لیے اردو ادب کی سب سے صقیل صنف رباعی کا انتخاب کیا جو وقت اور طویل مشق

طلب کرتی ہے۔ دراصل یہ صنف صوفیوں اور پختہ کار فنکاروں سے مختص سمجھی جاتی ہے، لیکن اسلم صاحب نے وسیع مطالعہ، تسلسل اور خیال کی برجستگی کو بروئے کار لاتے ہوئے صنف رباعی پر ماہرانہ عبور حاصل کرلیا ہے۔ جسے پڑھنے کے بعد دل و دماغ عش عش کر اُٹھتا ہے۔ ان کی رباعیات کے مطالعہ سے ہمیں اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ رباعی سے آپ کو فطری لگاؤ تھا جس کی وجہ سے غزل کے دائرہ اثر سے نکل کر رباعی کو آنکھوں سے لگایا اور ہونٹوں سے چوما اور ملکی وغیر ملکی سطح پر اپنی شناخت بنانے میں کامیاب بھی ہوئے اور اپنے فن سے اپنے ملک کا نام روشن کر رہے ہیں۔ بذات خود اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

اک کارنمایاں ہے رباعی گوئی
شہرت ہی کا ساماں ہے رباعی گوئی
فن کار اگر فن سے ہے واقف اسلم
مشکل نہیں، آساں ہے رباعی گوئی

☆☆☆☆

جوہی سے چنبیلی سے کنول سے بہتر
مرمر سے بنے تاج محل سے بہتر
اوصاف تجھے اس کے بتاؤں میں کیا
اچھی ہو رباعی تو غزل سے بہتر

☆☆☆☆

عصر حاضر کے رباعی گو شعراء میں ڈاکٹر اسلم پرویز اسلم صاحب کا نام کئی حیثیتوں سے نمایاں ہے۔ اب تک ان کے رباعیات کے تین مجموعے جن میں پہلا مجموعہ "پرواز" (نومبر 2010) اور دوسرا مجموعہ "شخصیات" (ستمبر 2021) اور تیسرا "آہنگ" (ستمبر 2022) منظرِ عام پر آکر قارئین سے داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ "شخصیات" 50 صفحات پر مشتمل اپنی نوعیت کی ایک منفرد کتاب ہے جس سے رباعیات کی پیشانی ہمیشہ تابندہ رہے گی۔ اس مجموعہ میں مختلف 99 ادبی شخصیات کو رباعی کی صنف میں کہیں عمدہ خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے تو کہیں ان کی خوبیوں کو اجاگر کیا گیا ہے تو کہیں ان سے اپنی بے پناہ عقیدت ومحبت کا کھلے دل سے اظہار کیا گیا ہے۔ ان ادبی شخصیات میں شامل سرِ فہرست نام شمس الرحمن فاروقی کا ہے۔ فاروقی کی ادبی خدمات اور فنی مہارت کو اسلم صاحب نے بڑی ہی سادگی و نفاست کے ساتھ چار مصرعوں میں ترتیب دیا اور بہت عمدگی سے لفظوں کا جامہ پہنایا۔ جیسا کہ ذیل کے رباعیات سے عیاں ہیں:

سب سے اعلیٰ فاروقی صاحب تھے
برتر بالا فاروقی صاحب تھے
اردو دنیا میں اسلم پرویز
ہر فن مولا فاروقی صاحب تھے

☆☆☆☆

اور آگے ان کی قادر الکلامی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

بامعانی ہے فاروقی کی تحریر
اک ہادی ہے فاروقی کی تحریر
دنیا چاہے مانے یا نہ مانے
لاثانی ہے فاروقی کی تحریر

☆☆☆☆

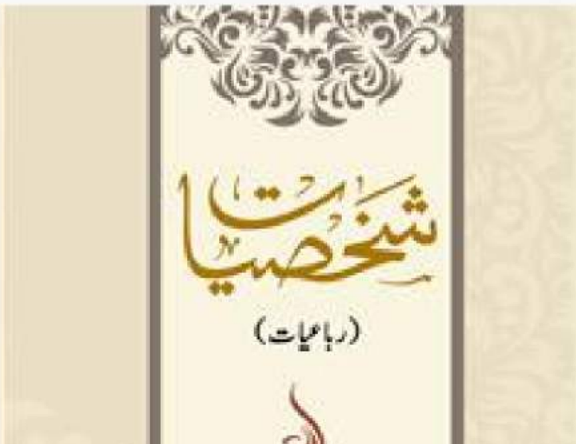

کہکشاں صفت شخصیت شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنی محنت، لگن، وقعت پسندی اور دلچسپی سے جو ادب تخلیق کیا ہے وہ اردو زبان کا بیش قیمتی سرمایہ ہے۔ اپنی سرکاری ملازمت کی مصروفیتوں کے سبب علم و ادب کی گرہیں کھولتے رہیں، وہ ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے جو بیک وقت کئی اصناف ادب پر دسترس رکھتے تھے۔ ان کے تعلق سے اسلم پرویز صاحب اپنی رباعی میں رقم طراز ہیں:

ہر صنف پہ ہے ان کی زبردست نگاہ
فاروقی کی تنقید بھی ہے اس کی گواہ
میں ذرہ نا چیز ہوں کیا خاک کہوں
بے ساختہ دنیا نے کہا دیکھ کے واہ!!

☆☆☆☆

تنقید کے گلشن میں بہار آئی
ہر صنف میں ہر فن میں بہار آئی
فاروقی کے افکار کی بارش ہی سے
اردو ترے آنگن میں بہار آئی

☆☆☆☆

فاروقی! نئی فکر کا عنواں ہے تو
ہاں!اپنے نظریے کا نگہباں ہے تو
یوں دوسرے نقاد بھی اچھے ہیں مگر
دنیائے ادب میں تو نمایاں ہے تو

☆☆☆☆

یہ بات اپنی جگہ مُسلم ہے کہ فاروقی کا شمار اردو کے نامور نقادوں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنی فنی صلاحیتوں سے ایسی ایسی کتابیں تخلیق کیے ہیں جو اردو ادب کے سرمایہ میں گراں قدر اضافہ کا سبب بنیں:

ہر لفظ یہ روشن ریاضت کا ہو
ہر ایک ورق میں ہے تری ہی خوشبو
تنقیدی افکار" ہے بے مثال کتاب
تعبیر کے ہیں اس میں ہزاروں پہلو

☆☆☆☆

ہر رنگ معانی کا مچل جاتا ہے
ہر لفظ کسی فکر میں ڈھل جاتا ہے
فاروقی کی تنقید کو پڑھ کر اسلم
تخلیق کا انداز بدل جاتا ہے

☆☆☆☆

تحقیق کا انداز سکھایا اس نے
کیا چیز ہے تخلیق بتایا اس نے
فاروقی کا ہم سب پہ نشہ طاری ہے
تنقید کا وہ جام پلایا اس نے

☆☆☆☆

شمس الرحمن فاروقی کی شخصیت اور فن کارانہ جہات کو اسلم صاحب نے رباعی کے پیرائے میں بڑی ہی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے، بلکہ یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ انھوں نے فاروقی کی فنی کارکردگی کو اپنی رباعی کے ذریعہ سمندر کو کوزے میں سمونے کا کام کیا ہے۔فاروقی کے بعد شخصی رباعیات میں جن شعرا کا نام آتا ہے ان میں ناوک حمزہ پوری ہے جو منفرد رنگ اور اسلوب کی وجہ سے اپنے ہم عصر شعرا میں ممتاز نظر آتے ہیں ۔ناوک حمزہ پوری نے اردو رباعی کی راہ میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں اس تعلق سے ڈاکٹر اسلم پرویز نے اپنی رباعی میں لکھتے ہیں:

آفت سے مصیبت سے نکالا تو نے
ہر رنگ میں روپ میں ڈھالا تو نے
ہے قابلِ تحسین کرشمہ تیرا
معیارِ رباعی کو سنبھالا تو نے

☆☆☆☆

ناوک کی شخصیت کے شایانِ شان اور صورت حال کے مطابق لفظوں کے استعمال کہ ہنر سے بخوبی واقف تھے، جو لفظ جہاں رکھ دیا مانو اس کا حق ادا کر دیا ہو۔اس حوالے سے موصوف لکھتے ہیں:

الفاظ کا ہو حسن کہ جملوں کا شباب
ہم عصر ادب میں ہے یقیناً کمیاب
دیکھی ہی نہیں میں نے ہنوز اے اسلم!!
تادیب ادب" جیسی زبردست کتاب

☆☆☆☆

اردو معلیٰ کے ثنا خواں ہیں ناوک
الفاظ و معنی کے گلستاں ناوک
وہ نظم ہو دوہا ہو رباعی کہ غزل
ہر صنفِ ادب کے ہیں نگہباں ناوک

☆☆☆☆

یہ اسلم پرویز صاحب کی انفرادیت ہے جو کسی بھی شعرا و ادبا کی شخصیت انکی ادبی کارنامے کو بڑی ہی سادگی، سلاست اور روانی کے ساتھ رباعی کے سانچے میں ڈھال دینے پر خلاقانہ قدرت رکھتے ہیں۔

اردو کی مشہور و معروف افسانہ نگار جیلانی بانو کے افسانوں کی فنی پختگی اور ان کی تخلیقات کی تنقید و تعریف کے لیے رباعی کو ہی وسیلۂ اظہار بنایا

افسانوں کا افسانہ بنا کر چھوڑا

ناول کا تو پیمانہ بنا کر چھوڑا
تخلیق میں جادو کا اثر ہے بانو
قاری کو تو دیوانہ بنا کر چھوڑا

☆☆☆☆

''تریاق'' سے دنیا نے لیا کچھ بھی نہیں
نروان ہوا "پھر بھی ہوا کچھ بھی نہیں
ہے جھوٹ کا بازار بہت گرم مگر
تخلیق تری سچ کے سوا کچھ بھی نہیں

☆☆☆☆

ہر دل کو محبت سے ٹٹولا تو نے
خاموش تھے سب شہر میں بولا تو نے
ہے تیرا کمال اے جیلانی بانو
رستہ تھا اگر بند تو کھولا تو نے

☆☆☆☆

محولہ بالا رباعیات فنّی پختگی،فکر و خیال کی بلندی اور فصاحت و بلاغت سے معمور ہیں،ان کا مطالعہ و مشاہدہ کافی وسیع ہے۔ وہ اپنی رباعیوں میں حقیقت بیانی وراست گوئی سے کام لینے کا ہنر خوب جانتے ہیں۔جیسا کہ ذیل میں چند رباعیات سیدہ جعفر کو بطور خراج پیش کی ہیں جو ان کے باطن کو آشکارا کرتا ہے:

اس عالم اردو میں معمر ہیں وہ
وہ راہ نما ہیں ابھی رہبر ہیں وہ
ہیں سیدہ جعفر کے کمالات
تحقیق میں مردوں کے برابر ہیں وہ

☆☆☆☆

تحقیق کے گلشن میں گلِ تر ہیں وہ
ہر علم کی خوشبو سے معطر ہیں وہ
وہ کون ہیں؟اب جن کی مہک ہے برسو
خاتونِ دکن سیدہ جعفر ہیں وہ

☆☆☆☆

اسلم پرویز کی شخصی رباعیات کے مطالعے کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے رباعی جیسی مشکل اور دقیق صنف کو جس طور سے گلے لگایا اور اس کے فن کی گہرائی و گیرائی میں اُترنے کی جو حتی الامکان کوششیں کیں ہیں وہ خوش آئند بات ہے اور مجھے کامل یقین ہے کہ اردو رباعی کی تاریخ جب بھی تحریر کی جائے گی، ڈاکٹر اسلم پرویز کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں کی جاسکتی ہے۔

اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے عظیم الرحمن رقم طراز ہیں:

"اسلم پرویز اردو کا سب سے کم عمر پختہ رباعی گو شاعر ہی نہیں بلکہ اردو شعر و ادب کا ایک مستقل ادارہ ہے، اخلاقیات و ایمانیات کے میدان میں ایک قندیل رہبانی ہے۔اتنی کم عمری میں ایسا روشن ستارہ کم ہی نمودار ہوتا ہے۔"

اسلم صاحب نے رباعی کے فن میں غوطہ زنی کی ہے، اس کے بعد اپنی ایک الگ راہ نکالی اور اسی میں ان کی فنکاری ہے۔

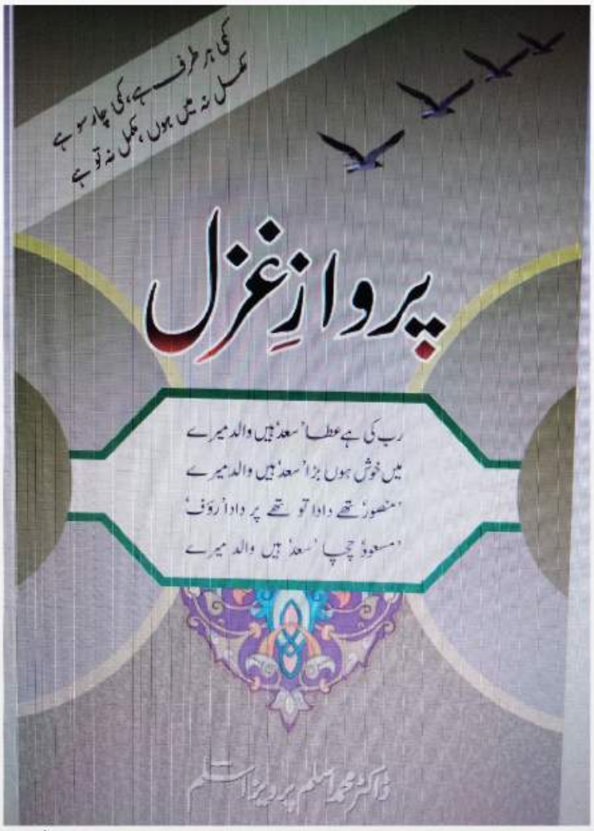

''شخصیات'' میں شامل تمام ادبی شخصیات کے بارے میں لکھنے کے لیے یک مبسوط مقالے کی ضرورت پڑتی ہے اس لیے میں اپنے اس مضمون میں چند اہم نام درج کرنا ضروری سمجھتی ہوں، جن میں سید امین اشرف، پروفیسر طلحہ رضوی برق، پروفیسر اشرف رفیع، شاہ حسین نہری، مظفر حنفی، پروفیسر عظیم الرحمن، پروفیسر علیم اللہ حالی، پروفیسر محمد علی اثر، کلیم الرحمن، حبیب صرا، ڈاکٹر عنوان چشتی، خورشید اکبر، ڈاکٹر کہکشاں تبسم، خورشید اکرم، ظفر کمالی، عالم خورشید، عتیق اللہ تابس، صفدر امام قادری، ابھئے کمار بیباک، ڈاکٹر پرویز اختر، ڈاکٹر عقیل احمد، مجتبیٰ

حسین، ثریا جبیں، ڈاکٹر نصرت جہاں اور دیگر کئی اہم شخصیات پر اظہار تحسین پیش کیا ہے اس کے علاوہ دوسو کے قریب غیر مطبوعہ شخصی رباعیات بھی قلم بند کر چکے ہیں۔

ان کی رباعیات میں ترکیبوں اور اصطلاحوں کی نادرہ کاری و تازہ کاری قابلِ توجہ ہے، جدید خیالات و افکار کو اپنانے کی وجہ سے ان کی رباعیات کی شگفتگی کو نئی رمق ملتی ہے۔ ناقدین نے اچھی رباعیوں کا ایک وصف یہ بھی بتایا ہے کہ اس کا آخری مصرعہ مکمل اور جامع ہونا چاہیے اگر چہ رباعی کے تینوں مصرعوں کو حذف کر دیا جائے تب بھی چوتھا مصرعہ اپنے معنی میں مکمل ہوگا، اسلم صاحب کی بیشتر رباعیاں اس صفت کی حامل ہیں۔ مثلاً

ہونا ہے گہر جس کو وہی آب ہے تو
اب چشمِ تمنا کا حسین خواب ہے تو
اردو کے نگہبان اے "سب رس" کے مدیر
دنیائے صحافت کا نیا باب ہے تو

☆☆☆☆

غالب کا حسین خواب ہے سنت ہے غزل
شاعر کے لیے ایک عبادت ہے غزل
لاکھوں میں نئی فکر کے شعراً لیکن
تابش کے تخیل سے "عبارت" ہے غزل

☆☆☆☆

یہ پیار ،خلوص اور محبت بھرا جام
ہے میری رفاقت کا عقیدت کا پیام
تم کہنا صبا دست بدستہ ہوکر
دخمہ" کے مصنف کو مرے دل کا سلام

☆☆☆☆

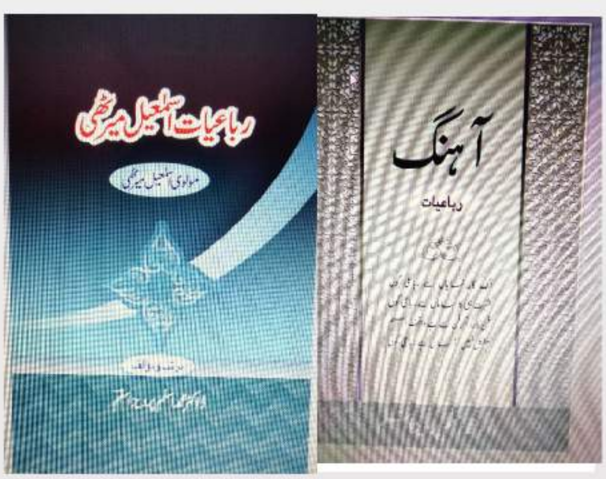

رباعی کا اسلوب جس حد تک سہل، سادہ اور آسانی سے سمجھ میں آنے والا ہوگا رباعی اسی قدر زیادہ پُر اثر اور اعلیٰ درجے کی ہوگی۔ چانچہ اسلم صاحب کی بیشتر رباعیاں اتنی سہل اور عام فہم زبان میں ہیں کہ اپنے شیشے پر عطف واضافت تک کا بال نہیں آنے دیا۔

المختصر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جناب اسلم پرویز صاحب کی ہر ایک رباعی سے ان کی قدرتِ کلام، فن پر ماہرانہ دسترس خاص طور سے فنِ رباعی کی نزاکتوں سے آگہی اور موضوعات و مواد پر ان کی عمیق نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ جہاں انھوں نے رباعیات نہایت توجہ اور فنکارانہ انداز میں کہی ہیں وہیں اس صنف کو وسعت اور مختلف جہتیں بھی عطا کی ہیں۔ اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے جناب تنویر پھول صاحب (نیویارک) گویا ہیں:

بے مثل قلم کار ہیں اسلم پرویز
شاعر ہیں، طرحدار ہیں اسلم پرویز
مہکایا قلم سے ہے رباعی کا باغ
اے پھول! وہ فنکار ہیں اسلم پرویز

حواشی:

1۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔ "اردو شاعری کا فنی ارتقا"، عفیف پرنٹرس لال کنواں دہلی 6۔1994، ص:308

2۔ ڈاکٹر محمد اسلم پرویز اسلم۔ "آہنگ رباعیات"، دی پرنٹ لائن سبزی باغ پٹنہ، 2022، ص:2

ایضاً۔9

3۔ ڈاکٹر محمد اسلم پرویز اسلم۔ "پرواز"، دی پرنٹ لائن سبزی باغ پٹنہ، 2021، ص

ایضاً۔9، 15، 99، 107

4۔ ڈاکٹر محمد اسلم پرویز اسلم۔ "شخصیات"، دی پرنٹ لائن سبزی باغ پٹنہ، 2021، ص:9

ایضاً۔11، 12، 13، 17، 19، 27، 28۔112

❑❑❑

SHAHINA PARWEEN
Research Scholar
Kazi Nazrul University
Asansol(West Bengal)
Email id:shahinajamuria@gmail.com

خوشبو پروین

عہدِ حاضر میں رباعی کے چند صاحبِ دیوان شعرا

رباعی اردو شاعری کی وہ صنف ہے جسے غزل قصیدہ مرثیہ اور مثنوی کے ہم پلہ قرار دیا جاسکتا ہے اس کا ٹھوس ثبوت یہ ہے کہ ہر دور میں اردو کے اہم شعرا نے رباعی کے میدان میں زور آزمائی کی اور اس سے صرف نظر نہ کر سکے۔ اردو کے صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ ان کے بعد سراج اورنگ آبادی اور ولی دکنی بھی رباعی کی طرف متوجہ ہوئے۔ شمالی ہندوستان میں سودا، میر سوز، مظہر جان جاناں، غالب اور مومن جیسے شعرا نے بھی رباعیاں کہی ہیں۔ لکھنؤ میں انیس و دبیر رباعی کے افق پر ستاروں کے مثل چمکے۔ نئے دور میں حالی اکبر جیسے ممتاز شعراء نے اس سلسلے کو آگے بڑھایا چنانچہ شاد عظیم آبادی، مہدی مجروح، امیر مینائی، داغ دہلوی، نظم طباطبائی، ریاض اور شوق قدوائی نے رباعی کے میدان میں بھرپور جوہر دکھائے۔ بیسویں صدی کے وسط میں رباعی کو مزید مقبولیت حاصل ہوئی۔ جوش، یگانہ، امجد، فراق، جگر، فانی اور حسرت جیسے شعرا نے رباعی کو تقویت بخشی۔ دور حاضر میں سینکڑوں شعرا موجود ہیں جن کے یہاں دو چار رباعیاں تو مل ہی جائیں گی ان شعرا کی کے علاوہ عہد حاضر میں بہت سے ایسے شعرا بھی موجود ہیں جن کے نہ صرف مجموعے ہیں بلکہ انھوں نے رباعی کو ہی اپنا میدان بنایا ہے نظموں اور غزلوں کی جگہ رباعی کو ترجیح دی۔ میں اس مضمون میں ان رباعی گو شعرا کا ذکر کروں گی جن کی رباعیات کے دیوان منظر عام پر آچکے ہیں جن کا رباعی کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے میرے علم میں یا یہ کہوں کہ ابھی تک کی میری تحقیق میں مجھے چند دواوین رباعیات ملیں ہیں جن کے تخلیق کار کے نام آئندہ سطور میں رقم کر رہی ہوں، ناوک حمزہ پوری، ہزار رنگ، عاصم شہنواز شبلی باغ صنوبر، صابر سنبھلی * رباعیات کے تین دِیوان مقبول احمد مقبول* احساس وادراک *ظفر کمالی 'خاک جستجو' عبدالمتین جامی 'ترانہ جاوید' شمیم انجم وارثی 'ورق ورق شمیم' ڈاکٹر عبدالحق امام نیرنگِ رباعی سراج العارفین انجیلِ خیال شاہ حسین نہری دیوانِ رباعیاتِ شاہ بانی۔ تحقیق کا یہ معاملہ ہے کہ کوئی بات حرف آخر نہیں ہوتی ہوسکتا ہے رباعی کے صاحب دیوان شاعر اور بھی ہوں جن تک میری رسائی ابھی تک نہیں ہو سکی۔ ان رباعی گو شعرا میں میری نظر میں رباعی کی دنیا میں سب سے معتبر نام ناوک حمزہ پوری کا ہے۔ ناوک حمزہ پوری کا اصل نام غلام السیدین اور تخلص ناوک ہے۔ ان کی پیدائش 12 اپریل 1933 میں گیا بہار میں ہوئی ان کے والد کا نام سید غلام رسول تھا اور وہ قوس تخلص کرتے تھے ناوک حمزہ پوری نے اپنی تعلیم اپنے والد اور اپنے ماموں سے حاصل کی۔ موصوف ابتدا ہی میں معلمی کے پیشے سے منسلک ہوئے اور 1998 میں سبکدوش ہوئے۔ انھوں نے نظم ونثر میں سو سے زائد کتابیں لکھی ہیں جہاں تک ناوک حمزہ پوری کی رباعیات کا تعلق ہے اس صنف میں ان کے چار

مجموعے اندازِ بیاں، شرارِ سخن، نوائے امروز اور تفہیم رباعی شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے علاوہ رباعیات کا دیوان ہزار رنگ منظرعام پر آ کر اہلِ علم و دانش سے داد و تحسین حاصل کر چکا ہے۔ ناوک حمزہ پوری تقریباً پچاس برسوں سے اپنی شمع اردو دنیا میں جلائے ہوئے ہیں انھوں نے نظم و نثر دونوں میں اپنے قلم کو روا رکھا ان سب کے باوجود رباعی کے دلدادہ نظر آتے ہیں ان کی مستقل کوشش یہی رہی ہے کہ رباعی گو شعرا کی تعداد میں اضافہ ہو، اور جہاں تک ہو سکا اس کی آبیاری کرتے رہے ہیں۔ اس پر وہ اللہ رب العزت کا شکر یہ بھی ادا کرتے ہیں اللہ نے ہر راز رباعی بخشا مولا نے مجھے ساز رباعی بخشا یہ صنف سخن ہے مجھے محبوب بہت نازاں ہوں کہ اندازِ رباعی بخشا۔ ناوک حمزہ پوری موجودہ دور کے سب سے قادر الکلام اور باکمال رباعی گو شاعر ہیں ان کی رباعیوں میں رنگارنگی اور بوقلمونی بدرجہ اتم موجود ہیں شاید ہی کوئی موضوع ایسا ہو جس پر اُنھوں نے رباعی نہ کہی ہو۔ ناوک صاحب کا تعلق ایک مذہبی خاندان سے ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی رباعیوں میں مذہبی رباعیات کا غلبہ نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ حمد، نعت، وعظ و نصیحت پند و اخلاق اور دنیا کی ناپائیداری کے موضوع پر انھوں نے بہت سی رباعیاں کہی ہیں۔

ناوک حمزہ پوری کی رباعیوں میں اگر موضوعات کی بات کی جائے تو ان کے یہاں ہر موضوع پر رباعی مل جائے گی ان کے یہاں موضوعات کا تنوع پایا جاتا ہے۔ لہجہ، بیان اور اسلوب نگاری بالکل سادہ ہیں موصوف کی رباعیاں برمحل برجستہ اور پرتاثیر ہیں۔

شاہ حسین نہری کا اصل نام سید شاہ حسین نہری ہے ان کی پیدائش 12 رفروری 1941 اورنگ آباد میں ہوئی۔ ان کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ 1972 میں منظرعام پر آ چکا ہے۔ شاہ حسین نہری کا پورا خاندان شاعروں کا ہے اس لیے شاعری ان کو ورثے میں ملی۔ شاہ حسین نیری کی رباعیات کے دو دیوان ہیں ایک ربیعہ دیوان رباعیات شاہ، دوسرا شاہ بانی دیوان رباعیات شاہ، ان کی رباعیوں میں فطرت کی عکاسی، روزمرہ کے مشاہدات، قوم کے درد کے ساتھ ساتھ ندرت خیال کے عناصر جابجا ملتے ہیں۔ ان کی رباعیوں میں موسقیت اور نیا پن ہے۔ زیادہ تر رباعی کہنے والے شاعروں کے یہاں دنیا کی بے ثباتی کا ذکر ملتا ہے۔ شاہ حسین نہری نے بھی دنیا کی بے ثباتی کو اپنی رباعیوں میں بڑے ہی خوبصورت انداز میں ڈھالا ہے۔

دنیا سے اے شاہ نہ ہرگز تو بھاگ
دنیا یہ تجھی سے ہے نہ لینا بیراگ
دنیا ہے آخرت کی کھیتی لیکن
ہے جس عمل اس کی سربزی لاگ

دیکھنے میں یہ رباعی بہت ہلکی پھلکی سی ہے لیکن شاعر نے اس میں بڑی چابکدستی کے ساتھ بہت بڑی بات کہی ہے دنیا نے آخرت کی کھیتی، رباعی میں ایسے جملوں کو بروئے کار لانا ایک کامیاب شاعری کی نشانی ہے۔ شاہ بانی دیوانِ رباعیات شاہ میں شاہ صاحب نے ایسی رباعیاں بھی شامل کی ہیں جن میں کلچر کا تعلق، رہن سہن، اخلاق و آداب زیادہ ہیں۔ ہم مغرب کے کلچر کو جس تیزی سے اپنا رہے ہیں اور اپنے اخلاق و آداب کو بالائے طاق رکھ چکے ہیں۔ اس موضوع پر بھی شاہ حسین نیری نے بہت سی رباعیاں تخلیق کی ہیں:

ہم جنسیت بے شرمی، فحاشی
عریانی، عیاشی، ناانصافی
ہے گرمئ بازار اباحیت تیز
انسان کو لے ڈوبے گی یہ بدطرزی

اردو رباعی کی دنیا میں ان کے دیوان اور مجموعے ایک قابل قدر اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ شاہ صاحب اردو کے مستند رباعی گو شعرا کی صنف میں اپنا مقام بنانے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

عبدالمتین جامی کی پیدائش 27 جولائی 1951 کو رسول پور ضلع کٹک اڑیسہ میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام شیخ ثناء اللہ اور والدہ ام اسلام تھیں۔ جہاں تک صوبہ اڑیسہ میں ادب کا تعلق ہے وہ بہت ہی کم عرصے کا حامل ہے۔ لیکن وہاں کچھ ایسے اساتذہ پیدا ہوئے جن سے صوبہ اڑیسہ کی ادبی حیثیت مسلم ہوئی جن میں مولانا برکت اور منظر حسین دسنوی جیسے اساتذہ تھے، جنھوں نے اڑیسہ میں ادبی ماحول کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ انھیں ناموں میں سے ایک اہم نام عبدالمتین جامی کا ہے۔ عبدالمتین جامی نے خود کو ادب کی تمام اصناف میں پھیلا رکھا ہے جس میں شاعری، تنقید، ڈراما، خاکہ، انشائیہ، جاسوسی ناول، اڑیہ اور بنگلہ کے ادب عالیہ کا ترجمہ وغیرہ شامل ہیں۔ اڑیسہ کی سرزمین سے پہلی بار رباعیوں کا مجموعہ تیار کرنے کا سہرا بھی عبدالمتین جامی کے سر ہے۔ جامؔی سے پہلے اڑیسہ کی سرزمین میں دوسری اصناف سخن کی آبیاری تو ہو رہی تھی لیکن رباعی جیسی اہم صنف سخن کی زلف سنوارنے کی ذمہ داری عبدالمتین جامی نے لی۔ ان کی رباعیوں کا دیوان ترانۂ جاوید کے نام سے 2016 میں منظر عام پر آ چکا ہے۔ حالانکہ زمانۂ قدیم سے لے کر اب تک اڑیسہ میں متعدد شعرا گزرے ہیں لیکن اب تک عبدالمتین جامی کے سوا کسی اور کے یہاں

پندرہ بیس سے زیادہ تعداد میں رباعیاں نہیں ملتیں۔عبدالمتین جامی نے رباعیوں کو لے کر تین قسم کے تجربے انجام دیے ہیں جن میں ایک آزاد رباعی، دوسرا ترانے بروزن رباعی اور تیسرا سانٹ بروزن رباعی۔بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ان تینوں میں سے کوئی ایک بھی ہمارے ادب میں چل نکلے تو اس کی اولیت کا سہرا یقیناً عبدالمتین جامی کے سر بندھے گا۔لیکن میری حقیر سی رائے یہ ہے کہ ترانے اور سانیٹ باضابطہ ایک صنف کے طور پر رائج ہے اب ایسے میں سانیٹ بروزن رباعی کچھ سمجھ نہیں آتا اور جہاں تک رباعیوں کا معاملہ ہے اس صنف کی سب سے بہتر ادا یہی ہے کہ اس نے کبھی بھی اپنے ہیئت سے سمجھوتہ نہیں کیا۔پچھلے آٹھ برسوں میں اس صنف نے نشیب وفراز کی منزلوں کو چھوا لیکن اپنے خدوخال سے کبھی مصالحت نہیں کی اور یہی اس صنف کی سب سے بڑی خوبی ہے اسی رویے نے اس صنف کو آج دورِ جدید میں بھی بلند رکھا ہے۔

ایک اچھے اور سچے فنکار کی پہچان یہی ہے کہ وہ چاہے جتنا بھی اچھا لکھ دے اس سے اس کو ہرگز اطمینان نہیں ہوتا۔کچھ ایسی ہی بے چینی اور اضطرابی کی کیفیت جامی کے یہاں دیکھنے کو ملتی ہے۔

میں خود کو ایک قطرۂ دریا لکھوں
کیا جسم سے روح کا رشتہ لکھوں
اک راز ہے انسان کی ہستی جامی
تھوڑی سی حیات میں کیا کیا لکھوں

اردو کے صاحب دیوان شاعر میں ایک نام ظفر کمالی کا ہے ان کا اصل نام ظفر اللہ اور قلمی نام ظفر کمالی ہے اردو ادب کی دنیا میں ظفر کمالی کے نام سے شہرت حاصل ہوئی۔ان کی پیدائش 13 راگست 1969 کو موضع رانی پور سیوان میں ہوئی۔ظفر کمالی شہر سیوان کے ایک استاد شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں وہ خاموشی کے ساتھ اردو ادب کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔تحقیق وتدوین، ادب اطفال، ترجمہ نگاری، مقدمہ نویسی وغیرہ ان کا میدان ہے۔ان سب کے علاوہ شاعری سے انھیں انسیت ہے اور خصوصاً ادب اطفال سے انھیں خاص لگاؤ ہے اس لیے انھوں نے ادب اطفال سے رباعی جتنی مشکل صنفِ سخن کی جانب قدم بڑھایا اور 2010 میں رباعیوں کے نام سے 385 رباعیوں پر محیط مجموعہ شائع کرایا۔وہ رباعیات ظفر کے نام سے رباعیوں کا دوسرا مجموعہ 2013 میں شائع ہوا جس میں 500 سے زائد رباعیاں شامل ہیں۔اس کے بعد 2014 میں بچوں کے لیے ان کی رباعیوں کا مجموعہ چہکاریں شائع ہوا جن میں تقریباً 266 رباعیاں شامل کی گئی ہیں۔

ظفر کمالی نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ اردو ادب کے لیے وقف کیا۔انھوں نے خود کو پہلے شاعری کے تمام فن سے آگاہ کیا بعد ازاں اردو رباعی کی طرف گامزن ہوئے۔انھیں اس بات کا کہیں نہ کہیں احساس بھی تھا جس کا اندازہ ان کی ایک رباعی سے لگایا جاسکتا ہے۔

سن سرمۂ ارباب بصیرت ہوں میں
قسمت سے جو ہاتھ آئے وہ دولت ہوں میں
اے دور رواں مجھ سے کترا کے نہ چل
پہچان مجھے تیری ضرورت ہوں میں

ظفر کمالی کے دیوان کا نام ''خاک جستجو'' ہے ظفر کمالی کی رباعیوں میں مختلف مضامین کو بڑی ہی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔موضوعاتی سطح پر ان کی رباعیوں میں رنگینیاں پائی جاتی ہیں۔چند رباعیاں ملاحظہ فرمائیں:

دل دوز ہی تحریر لکھی جائے گی
جب خواب کی تعبیر لکھی جائے گی
اب میری تمناؤں کے خوں سے شاید
اس ملک کی تقدیر لکھی جائے گی

ظالم ہو قصائی کی طرح لگتے ہو
شیطان کے بھائی کی طرح لگتے ہو
ایمان کوئی تم پر لائے کیسے
تم جھوٹی خدائی کی طرح لگتے ہو

ظفر کمالی کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے رباعی کے مخصوص ومقبول چوبیس اوزان میں سے ہر وزن میں رباعی کہی، کہیں کہیں تو انھوں نے ایک ہی رباعی میں چار الگ وزن کا استعمال بڑی خوبصورتی سے کیا، عروضی نقطۂ نظر سے بھی ظفر کمالی فن پر دسترس رکھتے ہیں رباعی کے ہر وزن پر مسلم ہے رباعی کے چوبیس اوزان میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے جو موصوف کے استعمال سے محروم رہ گیا ہو۔

اردو رباعی کی دنیا میں ایک قابل قدر صاحب دیوان شاعر کے طور پر مقبول احمد مقبول کا نام بھی شامل ہے ان کا اصل نام مقبول احمد ہے ان کی پیدائش ایک جنوری 1965 کو بیدر کرناٹک میں ہوئی۔انھوں نے اردو سے ایم۔اے۔ایم فل اور پی ایچ۔ڈی کی اور ابھی وہ مہاراشٹر کالج میں پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ان کی چند کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جن میں مضطر حیات شخصیت اور فن (تنقید وتجزیہ) 2006، آدمی ہو بہو اور احساس وادراک وغیرہ۔

احساس وادراک ان کی رباعیات کا دیوان ہے جو 2015 میں منظر عام پر آیا۔ اخلاق وانسانیت، جمالیات ورومانیت، بے ثباتی دنیا، حسن وعشق، تاریخ سماج مذہب اور زندگی کے موضوعات سے لبریز یہ دیوان اہل علم وادب سے داد وتحسین حاصل کر چکا ہے۔ وہ اپنی رباعی گوئی کے تعلق سے لکھتے ہیں کہ:

''غزل کے بعد رباعی گوئی میرا خاص میدان ہے جس میں، میں پندرہ سولہ برسوں سے طبع آزمائی کر رہا ہوں، ان شاء اللہ بہت جلد رباعیات کا مجموعہ بھی مرتب ہوجائے گا۔''

اور حسبِ وعدہ انھوں نے احساس وادراک کے نام سے رباعیوں کا دیوان اہل ذوق کے حوالے کیا ہے جس میں تقریباً 244 رباعیوں کو شامل کیا ہے کہ رباعی گوئی بچوں کا کام نہیں ہے اور مقبول احمد مقبول سے بڑے ہی جتن کے بعد اس فن پر دسترس حاصل کی ہے جیسا کہ اپنی ایک رباعی میں وہ خود کہتے ہیں:

اظہارِ حقیقت ہے نہ سمجھو اسے بڑ
ہے فن سخن پر مری جیسی ہی پکڑ
کیا عرض کروں جناب اس کی خاطر
اکتیس برس میں نے بیلے ہیں پاپڑ

مقبول احمد نے ''احساس وادراک'' میں مقررہ 24 اوزان میں تمام اوزان کو بروئے کار لانے کی کوشش کی ہے۔ ان کی بیشتر رباعیوں کو بہترین رباعی کے زمرے میں رکھا جاسکتا ہے۔ ان کی چند رباعیاں دیکھیے:

دنیا میں کوئی شے نہیں ایسی مولیٰ
پڑھتی نہ ہو تسبیح تیری مولیٰ
اشجار ہو ارض وسما شمس وقمر
کرتے ہیں بیاں تیری بڑائی مولیٰ

حق سے دامن جھٹک چکی تھی دنیا
ہر زاویے سے بہک چکی تھی دنیا
لے آئے جنت کی طرف سرورِ دیں
دوزخ کی طرف سرک چکی تھی دنیا

ہر قول بجا ہے نہ تو ہر بات صحیح
ہوتے ہیں کہاں سب کے خیالات صحیح
مانو نہ کوئی بات بنا غور کیے
ہے طرز یہی ٹھیک یہی بات صحیح

ہم کہہ سکتے ہیں کہ مقبول احمد مقبول کی رباعیوں میں خیال کی ندرت پائی جاتی ہے۔ اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی عاصم شہنواز شبلی ہیں۔ ان کی پیدائش 14 رفروری 1965 کو کلکتے میں ہوئی۔ ان کے والد جناب علقمہ شبلی مغربی بنگال کے مشہور ومعروف شاعر گزرے ہیں جن کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ جب عاصم شہنواز شبلی نے اپنی آنکھیں کھولیں اور جو فضا انھیں میسر تھی وہ شاعری کی تھی۔ یقینا یہی وجہ ہے کہ انھیں شعر وادب سے شغف ہے۔

''باغ صنوبر'' عاصم شہنواز شبلی کی رباعیات کا دیوان ہے جو 2019 میں منظر عام پر آیا۔ اس کتاب میں پانچ سو سے زائد رباعیاں شامل ہیں۔ ان کی رباعیاں ان کی فکر اور تخلیقی ذہانت کی آئینہ دار ہیں۔ عاصم شہنواز شبلی الفاظ کی سحر انگیز قوتوں سے نہ صرف واقف ہیں بلکہ انھیں اپنے شعری اظہار میں پیش کرنے کا ہنر بھی رکھتے ہیں۔ انھیں اس بات کا اندازہ ہے کہ شاعری کا سارا معاملہ الفاظ کے مناسب استعمال پر منحصر ہے۔ ان کی چند رباعیاں ملاحظہ فرمائیں:

جتنے بھی ہنرور ہیں سارے چپ چاپ
دنیا کے پشمبر میں سارے چپ چاپ
حکام نے بھیجے میں نوشتے کیا کیا
انصاف کے دفتر میں سارے چپ چاپ

دل تجھ سے لگانے بیانے میں بہت
اور تجھ کو جلانے کے بیانے میں بہت
آنکھوں میں کئی خواب تو پلتے ہیں مگر
خوابوں کو ملانے کے بیانے میں بہت

اس دور میں جینا بھی سزا ہے شاید
شانے پہ یہ کانٹوں کی ردا ہے شاید
تلوار ہے لٹکی ہوئی سر پر ہر دم
ناکردہ گناہی بھی خطا ہے شاید

اردو ادب کی تاریخ کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کم وبیش ہر شاعر کے یہاں رباعیات کے کچھ نہ کچھ نمونے موجود ہیں لیکن مستقل طور پر رباعیاں کہنا اور اس

ڈگر پر اپنے آپ کو جمائے رکھنا بڑی بات ہے۔ عاصم شہنواز شبلی اس بابت بڑی اہمیت کے حامل ہیں کہ انھوں نے اس صنف پر اپنی گرفت بنانے کے لیے نہ صرف کڑی محنت کی بلکہ خود کو ثابت قدم بھی رکھا۔ انھوں نے رباعیوں میں بڑی کامیاب کوششیں کی ہیں۔ انھوں نے بعض رباعیاں ایسی بھی کہیں ہیں جس میں ردیف نہیں ہے لیکن پھر بھی اس رباعی کی صحت پر کوئی خاص اثر نہیں پڑا۔ رباعی دیکھیے:

روشن ہیں تیرے نور سے میرے آفاق
پیدا اسی خاطر ہوئے مجھ میں اخلاق
تشکیک وتذبذب کا کہاں کوئی گزر
میں تاد اسلاف کے سارے اسباق

عاصم شہنواز شبلی نے رباعیات میں کئی طرح کے تجربے کیے ہیں ان کی رباعیات کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی رباعیوں میں رنگارنگی، دلکش انداز کے ساتھ تخیل کی بلند پرواز بھی موجود ہے۔ اس مضمون میں شامل شعراء کی فہرست میں جنھیں صاحب دیوان رباعی گو ہونے کا شرف حاصل ہے۔ شمیم انجم وارثی نے بہت ہی قلیل مدت میں اپنی الگ پہچان بنائی ہے ان کی پیدائش 20رمئی 1966 کو ضلع بکسر بہار میں ہوئی لیکن وہ مغربی بنگال میں مقیم ہیں۔ انھوں نے غزل کے ساتھ ساتھ رباعیاں اور نعتیں بھی کہیں ہیں۔ ان کی رباعیوں کا دیوان ورق ورق نام سے 2015 میں منظر عام پر آچکا ہے۔ شمیم انجم وارثی نے اپنی رباعیوں میں اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ رباعی کے مصرعوں کو اس طرح بیان کیا جائے کہ اس میں ایک خاص کیفیت پیدا ہوجائے۔ انھوں نے اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ آخری مصرعہ پر زور ہو۔

دیوان رباعیات میں ایک اہم رباعی گو شاعر عبدالحق امام ہیں۔ ان کا اصل نام عبدالحق اور قلمی نام ڈاکٹر عبدالحق امام ہے ان کی پیدائش محلہ مرزاپور کے شہر گورکھپور میں ہوئی۔ موصوف نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری متھلا یونیورسٹی بہار سے حاصل کی۔ ڈاکٹر عبدالحق امام دنیائے اردو شاعری میں رباعی گو کی حیثیت سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ دورِ جدید میں ابھی تک ناوک حمزہ پوری کا دیوان ہزار رنگ جو 2007 میں منظر عام پر آیا تھا اس میں 1156 رباعیاں شامل تھیں لیکن عبدالحق امام کی کاتب نیرنگ رباعی میں ۱۲۸۰ رباعیاں شامل ہیں نیرنگ رباعی کے تعلق سے پروفیسر محمد علی اثر کا کہنا ہے کہ:

’’اردو میں ضخیم ترین مطبوعہ رباعیات ہزار رنگ ہے جو حضرت ناوک حمزہ پوری کا ہے لیکن میرا کہنا ہے کہ 2014 میں صنف رباعی میں دنیا کا سب سے ضخیم مطبوعہ دیوان ڈاکٹر عبدالحق امام گورکھپوری کا نیرنگ رباعی ہے۔‘‘

سراج العارفین کی رباعیات کا دیوان ’’تخیل خیال‘‘ کے نام سے 2016 میں منظر عام پر آچکا ہے اس کے خالق سراج العارفین کا تعلق شہر بنارس سے ہے۔ صنف رباعی میں جن شاعروں نے اپنی اپنی پہچان مقرر کی ہے ان میں سراج العارفین کی کوشش بھی لائق تحسین ہے۔ ان کے یہاں متضاد رباعیاں دیکھنے کو ملتی ہیں ایک نئے جوش انھوں نے رباعیات کے فن میں کئی طرح کے نئے تجربے کیے ان کی رباعیات مضامین میں تازگی محسوس ہوتی ہے سراج العارفین نے رباعی کے چوبیس اوزان کو چھ رباعیوں میں سمیٹ کر یہ دکھایا ہے کہ ان کو فنِ رباعی میں بھی دسترس حاصل ہے۔

ڈاکٹر صابر سنبھلی کا اصل نام صابر حسین اور قلمی نام صابر سنبھلی ہے ان کی پیدائش 29رجولائی 1942 میں سنبھل میں ہوئی۔ انھوں نے اردو میں پی ایچ۔ڈی کی، ان کی خدمات کے اعتراف میں انعامات واعزازات سے نوازا گیا۔ ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ ان کی رباعیات کا دیوان رباعیات کے تین دیوان کے نام سے 2017 میں شائع ہوا۔

المختصر رباعی کے ان دواوین کو دیکھ اور پڑھ کر اس بات کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ رباعی کی جو پہچان زمانہ قدیم سے اب تک قائم ہے اس میں کوئی کمی نہیں آئی۔ اس صنف سخن میں تجربے کرنے والوں نے کئی طرح کے تجربات کیے لیکن اس کی اصل شکل کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکا۔ ان تجربات سے اس کی صحت پر کوئی خاص اثر بھی نہیں پڑا دورِ جدید میں رباعی نے اپنی شناخت کو اور بھی مستحکم کرلیا ہے۔ اور یہ عمل اس صنف سخن کے لیے ایک خوش آئند بات ثابت ہوگی۔

□□□

Khushboo Perween
Research scholar
University Of Delhi
K,12 Third Floor Haji Colony
Ghaffar Manzil Jamia Nagar
New Delhi-110025
Mo 7644096273

عائشہ دولت

اس کی ہے ہر نشانی

دریا کی یہ روانی
موجوں کی یہ شرارت
ریتوں کی میزبانی
بکھری ہوئی فضا میں
پھیلا ہوا کنارہ
جذبات کے
یہ سیپ و موتی
قدرت کی ہے نمائش
تنہائیوں کا ڈیرہ
اک شام ڈھل رہی ہے
اگتا ہوا سویرا
بادل کے رقص پیہم
گاتا ہوا یہ ساگر
بجتے ہوئے یہ گھنگھرو
گاتے ہیں حمد و ثنا کوئی
کوئی نغمہ زیرِ لب ہے
قدرت کا یہ کرشمہ
پیغام دے رہا ہے
یہ کائنات یوں ہی
پیدا نہیں ہوئی ہے
یہ سب ہے اک خدا کا
اس کی ہے ہر نشانی

Ayesha Siddiqua
#163/72
N.S.K Street
Old Pet,
Krishnagiri-63500 (Tamilnadu)

شبانہ عشرت

غزلیں

اب کسی چیز پہ چلتا نہیں چارہ اپنا
خاک سمجھے گا کوئی اور اشارہ اپنا

زندگی تجھ کو میں ٹھکرا کے چلی جاؤں گی
خوب دنیا نے بنایا ہے تماشہ اپنا

گردش وقت کے ہاتھوں رہی الجھی ایسی
جانے کب ڈوب گیا بخت کا تارہ اپنا

یہ محبت ہے اسے طوقِ غلامی نہ سمجھ
یوں ہر اک شۓ پہ میری، رکھ نہ اجارہ اپنا

اسی امید پہ ہر روز جیے جاتی ہوں
پھر سے چمکے گا کسی روز ستارہ اپنا

چھوڑنے والے تجھے میں نے پکارا بھی نہیں
تونے خود سے ہی گنوایا ہے نظارہ اپنا

نہیں کرتے ہیں دیوانے شکایت
گناہِ عشق کی جتنی سزا دو

میں کیسی تھی، تمھیں کیسے بتاؤں
تمھیں حق ہے، مجھے جیسا بنا دو

تمھیں جب لوٹ کر آنا نہیں ہے
تو پھر یادوں کے سب دیپک بجھادو

نہیں حاصل ہے نفرت سے یہاں کچھ
اٹھائی ہیں،، جو دیواریں گِرا دو
دعائیں ہی ملیں گی تم کو عشرؔت
دلوں میں آگ الفت کی لگا دو

Shabana Ishrat
Shabana Ishrat
C/O Late Abdul Rahman
Milan House, Near Shadi Mahal
Dargah Road, Patthar Ki Masjid
Patna-800006 (Bihar)

ترجمہ

شام اور سمبل کے سائے

ڈاکٹر وفا یزدان منش

کافی کا کپ ہونٹوں کے قریب لاتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے سفید پردہ ایک طرف ہٹاتی ہے، سورج کی کرنیں پھولوں کا رنگ اور زیادہ چمکا رہی ہیں، وہ آسمان کی طرف نظر اٹھاتی ہے نیلگوں آسمان ہمیشہ سے زیادہ صاف نظر آرہا ہے، پرندے صرف چہچہا نہیں رہے؛ لگتا ہے سریلی آواز میں گنگنا بھی رہے ہیں، یوں لگتا ہے جیسے، آج سب کچھ اوجھل سے نکل کر حقیقی روپ میں دکھتا ہے۔ یوں اس سے پہلے ساری کائنات پردھول پڑی تھی۔ وہ فون کی بیل سے چونکتی ہے، بے دلی سے ذکیہ کا فون سنتی ہے: "تمھارا افسانہ ابھی پڑھا، زبردست! لگتا ہے یہ تمھاری اپنی کہانی ہے، واقعات سچ سچ لگ رہے ہیں۔ مبارک ہو"۔

"ہمم، میرے سارے افسانے میرے ہی لگتے ہوں گے کیونکہ میں اپنے ہر افسانے میں جنم لیتی ہوں۔ سنو! میں کافی پی رہی ہوں۔ تمھیں پتا ہے کافی پیتے وقت خاموشی مجھے پسند ہے۔ بائے"۔ سویرا قدرے دبی آواز میں بولتے ہوئے فون بند کر کے سائیلنٹ بھی کرتی ہے۔ سویرا کے پورے وجود پر بے چینی حاوی ہے۔ اپنا دل بہلانے کی کوشش کرنے لگتی، کافی کو ایک گھونٹ پی کر کپ گال پر لگاتی ہے، گویا اس کی گرمی سے اپنے وجود کی ٹھنڈک گھٹا رہی ہے۔ پودوں سے پیار کر کے اور گھونٹ لیتی ہے۔ ایسے وہ کافی کو ختم ہونے نہیں دے رہی۔ اس کو یہ افسانہ لکھے ہوئے عرصہ ہو گیا ہے۔ چھپنے میں دیر لگی اور اب بھی اسے خوف ہے کہ چھپنے میں کہیں غلطی ہوئی ہو۔ اس کے ذہن پر ایک ہی سوال سوار ہے، کہ کیا راضی کو بھی اس افسانے کا پتا لگ گیا ہے! اس سے کیسے چھپا دوں!

دوپہر کو سورج کی سنہری کرنیں کمرے کے بیچ تک پھیل گئیں ہیں، فون کی سکرین پر" راضی جان" دمک رہا ہے۔ سویرا اس کا فون اٹینڈ کرنے میں کبھی دیر نہیں لگاتی تھی مگر اس دفعہ مشکل سے اکسپٹ کا بٹن دباتی ہے۔" جانی! تمھارا نیا افسانہ آیا ہے، تم نے اس افسانے کے بارے میں کچھ کہا نہیں تھا!"

وہ صحیح کہہ رہا تھا، ہمیشہ افسانہ ختم ہوتے ہی راضی کو پڑھنے کے لیے دیتی ہے، اس سے مشورہ طلب کرتی ہے، مگر اس دفعہ اس کی ہمت کہاں؟ کیسے اس سے پڑھوا دیتی؟ سویرا مشکل سے لعاب نگل کے اپنی آواز میں کھٹکا چھپانے کی کوشش کرتی ہے،" ہاں، شاید یاد نہیں رہا، تم کافی مصروف تھے اس لیے۔۔۔"

راضی کھلتی ہوئی آواز میں جیسے خوشی سے پھولا سما رہا ہو اس کی بات کاٹتا ہے، کوئی بات نہیں، اب وہ میرے سامنے کھلا ہے۔ پڑھنے کے لیے ایک لمحہ بھی ضائع کرنا نہیں چاہتا، جیسا ہمارا رواج ہے کہ تمھارا نیا افسانہ نکل آتے ہی، ہم خوشی منانے کے لیے باہر کھانا کھاتے ہیں۔ اس دفعہ تم نے یہ افسانہ نہیں دکھایا مجھے؛ اس لیے اس بار تمھیں جرمانہ یہ ہو گا کہ باہر کھانا تمھیں کھلانا پڑے گا۔ اب سوچو کہاں کھلاؤ گی۔۔۔؟"

اس کے لہجے میں اتنی مسرت تھی کہ سویرا جو ہچکچا رہی تھی، جھٹ سے بولی: "اب کیا جلدی ہے پڑھنے میں، رہنے دو۔۔۔"

راضی نے زور سے اور دھیمے دھیمے لہجے میں کہا: "تمھارا لکھا ہوا ایک ایک لفظ بھی مجھے بھاتا ہے، بند کرتا ہوں فون، پڑھنے لگا ہوں۔۔۔"

> ”میری اور اس کی چاہت باقی اکثر جوڑوں کی طرح رہی، شروع میں کچھ اور آخر میں کچھ اور! شروعات میں عاطف نے مجھے منانے میں ہر طرح کی تدبیریں کیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس نے مجھے پھنسا دیا۔ ہم ایک ہی فیلڈ میں جاب کرتے تھے مگر کبھی یہ بات نہیں سوچی تھی کہ میرا دل اس کے لیے جگہ بنائے گا۔ بس جو ہونا تھا وہ ہوگیا۔ شادی کی بات کرتا رہا مگر رشتہ بھیجنے کی ٹال مٹول رہی، ہم دونوں ہی چاہتے تھے کہ فی الحال کسی کو اپنے تعلق کے بارے میں پتا ہونے نہ دیں ۔ ہمارے جتنے مشترکہ دوست تھے وہ طعنہ دیا کرتے تھے کہ تم دونوں کا اچھا جوڑ ہے۔ دیکھنا بہت جلد عاطف تم سے شادی کی بات کرے گا ۔ میں ان کو روکتی کہ بکواس بند کریں۔“

میری اور اس کی چاہت باقی اکثر جوڑوں کی طرح رہی، شروع میں کچھ اور آخر میں کچھ اور! شروعات میں عاطف نے مجھے منانے میں ہر طرح کی تدبیریں کیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس نے مجھے پھنسا دیا۔ ہم ایک ہی فیلڈ میں جاب کرتے تھے مگر کبھی یہ بات نہیں سوچی تھی کہ میرا دل اس کے لیے جگہ بنائے گا۔ بس جو ہونا تھا وہ ہوگیا۔ شادی کی بات کرتا رہا مگر رشتہ بھیجنے کی ٹال مٹول رہی، ہم دونوں ہی چاہتے تھے کہ فی الحال کسی کو اپنے تعلق کے بارے میں پتا ہونے نہ دیں۔ ہمارے جتنے مشترکہ دوست تھے وہ طعنہ دیا کرتے تھے کہ تم دونوں کا اچھا جوڑ ہے۔ دیکھنا بہت جلد عاطف تم سے شادی کی بات کرے گا۔ میں ان کو روکتی کہ بکواس بند کریں۔

باقی کہانی بھی کوئی خاص چلتی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ جیسا سب کے ساتھ ہوتا ہے، آخر ایسا موڑ آتا ہے کہ دھیرے دھیرے الوداع کا زہر، گھونٹ گھونٹ پینا پڑتا ہے۔ ادھر ادھر کی باتوں نے مجھے جھنجھوڑ دیا کہ عاطف کی نیت دوسری لڑکیوں کے ساتھ ٹھیک نہیں۔ یہ خبر تیر سی لگی مجھے جس سے میرا دل داغ داغ ہوا۔ پھر سوچا یہ جلن جو فطری طور پہ لڑکیوں میں ہوتی ہے غلط ہے، پڑھی لکھی باشعور لڑکی ہوں یہ گھٹیا کیفیت میری نہیں ہونی چاہیے۔ مرد کا وقتی طور پہ دوسروں کی طرف شاید میلان ہو اس سے زیادہ کیا ہوسکتا۔ اس احساس کو دبا کے عاطف کو اپنا بنانے میں مگن رہی مگر گتھی میں ڈالی ہوئی بات کسی اور کی کوشش اور سمجھانے سے ٹھیک نہیں ہو پاتی۔

عاطف کو اپنی کمپنی میں بڑی ترقی ملی، اس نے تمام دوستوں کو بڑی دعوت دی، میں تیار ہو کے گئی۔ عصر کے وقت میں ہوٹل پہنچ گئی۔ جہاں اعزازی تقریب منائی جا رہی تھی۔ تقریباً سبھی آ چکے تھے۔ لوگوں کی بھیڑ بھاڑ تھی اور اتنے ہجوم میں صرف ایک شخص مجھے دکھتا تھا۔ اس کو دیکھتے ہی میری سانس میں سانس آئی۔ باری باری تقاریر ہو رہی تھیں۔ تقاریر کے بیچ میں ایک بھیانک وقفہ آیا اور میں اس دفعہ خود کو دھوکا دینے میں ناکام رہی۔ پڑھی لکھی ہوں یا ان پڑھ، عقلمند ہوں یا گنوار، آخر انسان ہوں، یہ دل ہے، اس کو سمجھانا مشکل ہے، جس کے دل کا مالک خود کو سمجھتی تھی، اسے کیسے دوسروں کے پاس دیکھ سکتی تھی۔ میں نے کئی دفعہ عاطف کو کسی لڑکی کے ساتھ آنکھوں سے اشاروں میں بات کرتے ہوئے دیکھا۔ اس دفعہ واقعی آگ سی میرے دل میں لگی جس کو بجھانے کے لیے ایک ہی طریقہ سوچا۔ اپنے ارد گرد نظر دوڑائی۔ حاضرین میں سے کسی کی طرف نظر پڑے تو فوراً اس نے مسکرا دیا جیسے کہ پتا نہیں کب سے بیچارہ نظریں ملانے پر منتظر رہا جب تک میری نظر ایک سنجیدہ آدمی پر پڑی۔ جس نے تقریر بھی کی تھی۔ گہری نگاہوں اور اداس آنکھوں والا اور کسی سے گھل کے نہیں ملتا تھا، اس کی تقریر بھی اتنی ہی گہری اور سنجیدہ تھی۔ پروگرام اختتام تک پہنچ رہا تھا کہ میں نے اس کی طرف قدم بڑھا دیا، پہلی دفعہ ایسا ہوا کہ میں خود کسی آدمی کی طرف پہل کر رہی تھی، خود کا تعارف کراتے ہوئے مسکراتے اور دلربانہ انداز میں کہا: " آپ کی تقریر پختہ تھی، یہ میرا ویزٹینگ کارڈ" ۔ اس کی آنکھوں میں ایک لمحہ روشنی اٹھی، اس کا ویزٹنگ کارڈ بھی میرے ہاتھ میں تھم گیا۔ کارڈ کو دیکھے بغیر بیگ میں ڈالا، اس کا نام بھی ذہن میں نہیں رکھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ یہ بات یہاں تک ختم نہیں ہو پائے گی، مگر میرے لیے ختم ہوگئی تھی کیونکہ اس کے بعد عاطف حسب معمول بات بھلانے میں کامیاب رہا اور میں بھی اس کو کھونے کے لیے ابھی تیار نہیں تھی۔

دو دن کے بعد عاطف نے کہا کہ ان مہمانوں میں ایک میرا عزیز دوست میکائیل آیا ہوا تھا۔ اس نے سب کو عصرانے کے لیے بلایا ہے، میں بہانہ بنا رہی تھی، اصل میں میرا دل کسی جگہ جانے یا کسی سے ملنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ اس نے زبردستی مجھے راضی کر کے روانہ کر دیا۔ شام کو باغ میں دلکش فضا تھی۔

اسی گہری اور سنجیدہ نگاہ کا مالک فوراً میرے استقبال کے لیے سامنے آیا۔ اوہو، تو یہ ہے میکائیل! وہ تھوڑی دیر ساتھ بیٹھا اور کہا کہ کئی دفعہ آپ کو میسج ارسال کیے، آپ نے پڑھے ہی نہیں۔ اب وہ اداس آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔ جب وہ اٹھ کے گیا تو عاطف نے حیران ہو کے پوچھا کہ کیسے تم سے رابطہ کیا تھا، میں خوش ہو رہی تھی عاطف کو جلتے دیکھ کر، بس یہی اک کیفیت تھی جو مجھے محظوظ کر رہی تھی۔

عاطف کی آگ مزید بڑھانے کے لیے اس کے سامنے میسج پڑھنے لگی: " آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ امید ہے آپ ہمیشہ خوش رہیں۔ میں نے سب کو چائے کی دعوت دی ہے عاطف صاحب آپ کو بتائیں گے؛ مگر میں آپ کو خصوصی طور پر بذات خود دعوت دے رہا ہوں، آپ سے دوبارہ ملنے کی خواہش ہے"۔

"عاطف غصہ کرنے لگا کہ تمہارا نمبر میکائیل کے پاس کیسے گیا؟ کیسے اس کو ہمت ہوئی اس طرح مسیج دینے کی۔ وہ بولتا جارہا تھا میں نے اتنا کہا کہ: " ویزیٹنگ کارڈ سے یہ آسانی پیدا ہوتی ہے ویسے کوئی بات نہیں تم بھی آزماؤ کہ جلن کیسی ہوتی ہے۔ عاطف نے یہ کھلے منہ سے پوچھا، " کیا مطلب؟" میں نے دانت پسیجتے ہوئے کہا بس تم خود سمجھو۔"

عاطف غصہ کرنے لگا کہ تمہارا نمبر میکائیل کے پاس کیسے گیا؟ کیسے اس کو ہمت ہوئی اس طرح میسج دینے کی۔ وہ بولتا جا رہا تھا میں نے اتنا کہا کہ: " ویزیٹنگ کارڈ سے یہ آسانی پیدا ہوتی ہے ویسے کوئی بات نہیں تم بھی آزماؤ کہ جلن کیسی ہوتی ہے۔ عاطف نے یہ کھلے منہ سے پوچھا، " کیا مطلب؟" میں نے دانت پیسجتے ہوئے کہا بس تم خود سمجھو۔

اتنا میرے لیے کافی تھا، یوں لگ رہا تھا کہ جیسے میں ہلکی ہو گئی ہوں۔ کچھ عرصے تک ہمارے تعلقات بگڑتے رہے۔ عورت ٹوٹتے ہوئے بھی رشتہ نبھانے کی کوشش کرتی ہے، مگر یہی عورت فطری طور پر ہر بار ٹوٹنے سے ایک قدم پیچھے چلی جاتی اور بالآخر بار بار ٹوٹتے رہنے سے وہ بہت پیچھے چلی جاتی ہے، اتنا کہ لاتعلقی کا رس خود چوستی ہے، چاہے اسے زہر جیسا ہی لگے اور وہ خود کو صفر پر لا کھڑا کرتی ہے۔ خیر زندگی کی تلخ حقیقتوں کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے۔ میرا بھروسا عاطف پر ختم ہوتا گیا اور ہمارا رشتہ بالکل ٹوٹ گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ میکائیل کے میسجز آتے رہے۔

میرے مشکل دن گزر گئے، سب کچھ سہہ گئی، دل کا خالی پن مجھے تکلیف دے رہا تھا۔ سنا ہے بچھڑ جانے کے غم کا بوجھ زیادہ سے زیادہ چھ مہینے تک اٹھانا پڑتا ہے۔ اتنے عرصے میں بوجھ ہلکا ہوتا جاتا ہے، بس خود کو بار بار سمجھانے اور تسلی دینے سے دو مہینے تک میرے دکھ کا اثر باقی نہیں رہا، البتہ اتنا ہوا کہ مختصر سی راکھ دل میں بیٹھ سی گئی۔ شاید میکائیل کی وجہ سے یہ کٹھن راستہ میرے لیے توقع سے زیادہ ہموار ہو گیا تھا کیونکہ میکائیل اپنے دل کی باتیں سنا رہا تھا اور وہ تہہ دل سے رشتہ بھی مانگ چکا تھا۔ میں اس کو سمجھانے کی کوشش کرتی رہی کہ میرے دل میں اس کے لیے کوئی ایسا جذبہ نہیں ہے، مگر اس کا لگاؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ میکائیل کا کہنا تھا کہ اس تقریب میں وہ میری طرف متوجہ ہوا تھا اور اس شام باغ میں، چائے کی دعوت پہ اس کو اپنے احساس کا یقین پیدا ہوا۔ وہ اس شام کو پنپنے والے پیار کے اظہار کو گردانتا رہا اور میں اس کے اظہار محبت کے سامنے متاثر ہوئے بغیر ایک مورتی کے جیسی کھڑی مگر لاشعوری طور پر اس کا اظہار محبت میرا حوصلہ بڑھانے میں مثبت طور پر اثر انداز ہو رہا تھا۔ وہ ہمیشہ یہی بات دہراتا رہتا کہ پتا نہیں قدرت کو کیا سوجھا کہ آپ سے ایک لمحے کو ملوا کے میری زندگی میں اتنی زیادہ تبدیلی آ گئی۔

" پتا ہے؟ تم سے اچانک پہلی نظر میں پیار ہو جانے کا حسین اتفاق، اس دن قدرت نے مجھے تم سے ملوا دیا پھر سارا دن برسات ہوتی رہی اور 15 نومبر کی باغ میں ایک شام سمبل کے درخت کے نیچے کسی کی آنکھوں سے محبت کا جذبہ ہے۔ اس شام آپ کی آنکھوں کی تیز روشنی میں، اپنی کہانیوں کا انجام، اپنی تلاش کا خاتمہ، ایک خوشی کا جواب، ایک راز کا حال، طویل سفر کے بعد ساحل نظر آنے کی مسرت اور یہ احساس کے مجھے ان ہی آنکھوں کی تلاش تھی۔ مجھے جیسے صدیوں سے تمہارا انتظار تھا"۔

جیسا میکائیل نے سنایا تھا پہلی ملاقات میں مجھے اس کو اپنی طرف مائل کرنے سے پہلے ہی، اس نے اپنا دل مجھ سے لگا لیا تھا، پھر میرا ضمیر مجھے ستا رہا تھا کہ میں نے اس کو کہیں کھلونے کی طرح استعمال تو نہیں کیا! کوئی میری تدبیر نہیں چل رہی تھی۔ میں اس کو دھوکا دینا نہیں چاہتی تھی،

جس حالت سے میں گزر رہی تھی اب کسی اور سے دل لگانا غلط بات تھی اور یہ احساس الگ کہ خود کو میکائیل کے ابھرتے ہوئے جذبات کے سامنے قصوروار سمجھتی تھی۔

عاطف کے بعد میں نہیں چاہتی تھی کہ کسی اور کے بارے میں ذرا سا بھی سوچوں۔ میکائیل کی پروقار شخصیت کی ضرور عزت کرتی ہوں مگر دل کا دروازہ بند پڑا تھا۔ کیسے دل میں جذبات بھر سکتی تھی؟

وہ ڈیڑھ سال تک میرا انتظار کرتا رہا۔ ایک دن جب اس نے کہا " میں آپ کے آس پاس آپ کے ساتھ گزرے ہوئے وقت کو مختلف باتوں کو بار بار ذہن میں دہراتا رہتا ہوں۔ ہر لمحے میں انہی کیفیات میں واپس جانے کی کوشش کرتا ہوں، جس شام میں نے آپ کو پہلی بار دیکھا۔۔۔اے پورا چاند اور آدھی عورت، اب یہاں تو پوجا ہو رہی ہے آپ کی۔ اس دن دل کو وہ اطمینان، سکون اور گہری خوشی ملی، کہ جس کا بیان ناممکن ہے، مجھ سے۔ ایک خاموش اور اندر چھپی ہوئی کسی راز جیسی خوشی"۔ میکائیل نے ہلکی سی سرگوشی کرتے ہوئے پوچھا؛" آپ کے دل کی کب سنوں گا؟" میں نے دل ہی دل میں جواب دیا کہ نہ جانے میں تمھاری چاہت کے قابل ہوں کہ نہیں۔ کاش! میرے دل میں تمھارے لیے پیار پیدا ہو جائے"۔

ایک دفعہ مکائیل کا فون آرہا تھا، ہیلو کہہ کر ایک زنانہ آواز سنائی دی،" میں میکائل کی امی ہوں، تارا بیٹا! مجھے تم سے ملنا ہے"۔ پتا نہیں کیسے میں نے بچپنے والی بات کی کہ" میں شادی فی الحال نہیں کرنا چاہتی"۔ انہوں نے دلنشین آواز میں بولتے ہوئے کہا:" شادی کی بات نہیں کرنی، بس میں یہ دیکھنا چاہتی ہوں کہ وہ کیسی عورت ہوگی جس پر میرا بیٹا فدا ہے"۔

میکائیل نے مجھے اپنے خاندان سے ملوایا اور کہا کہ میرے جیون کی ساتھی، مجھے مل گئی ہے، اب دیکھیں کہ تارا کب اپنے دل کی آواز سنے گی؟

آہستہ آہستہ اس کی سکون دہ آواز میرے کان میں گونجتی رہی، اس کے پرخلوص جملے میری زندگی کا آسرا بننے لگے، ٹپ ٹپ قطرہ قطرہ گرتے ہوئے پانی کی آواز کی طرح!۔۔۔۔۔ میرا دل جڑ گیا اس کی روح سے اور میری روح اس کے پیار سے جگمگا رہی تھی۔ آخر، میرے دل کو اس کی منزل مل گئی۔ ایک دن وہ میرے کہنے پر اس باغ میں گیا، میری ہدایت پر اسی سمبل کے درخت کے نیچے کھڑا ہوا اور پھر اس دن میں نے تہہ دل سے اپنی محبت کا اظہار کیا۔

میکائیل اپنی اس بات پہ ڈٹا رہتا! کہ تارا تمھیں پہلی نظر میں مجھ سے پیار ہو گیا تھا، مگر تم ماننا نہیں چاہ رہی ہو۔

اس وقت سے اب تک سات سال گزر رہے ہیں، روز اس کے لیے تڑپتی ہوں، روز سوچتی ہوں کہ اسے سوچنے سے میرے سارے ارمان جاگ جاتے ہیں۔ روز سوچتی ہوں کہ اس کو اور زیادہ کیسے خوشیاں دوں۔ ہم اس باغ میں جاتے رہتے اور ٹہلتے ہیں۔ اپنے سپنے ہلکی ہواؤں کے سپرد کرتے ہیں۔ ہم دونوں کی محبت اسی باغ میں سمبل کے درخت کی طرح پروان چڑھ رہی ہے، اس کا سایہ پھیلتا جا رہا ہے، کوئی خزان ہمارے درخت کے قریب سے نہیں گزرتی ہے۔ اب سوچتی ہوں کہ زندگی اتفاقات کا کھیل ہے یا ہم خود اپنی زندگی کے اتفاقات سے کھیلتے ہیں؟ میکائیل کو پیار دیکھتے ہی دیکھتے مل گیا، عقل کی ہدایت سے میرا دل لمبے عرصے کے بعد خود کو ٹٹولنے بیٹھا۔ لیکن دونوں کی محبت پرخلوص اور سچی ثابت ہوئی۔

رات کافی ہوگئی ہے، چھ بجے سے سویرا تیار بیٹھی سوچ رہی ہے کہ راضی نے افسانہ پورا پڑھا ہوگا، پھر مجھے فون تک کیوں نہیں کیا! اس کا کیا تاثر ہوگا! کیا وہ اس تحریر کو صرف ایک بناوٹی افسانہ سمجھے گا؟ نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔

" ہیلو راضی! کئی بار میسیج کیے، فون کیا، تم ٹھیک ہو! کہاں ہو!"۔ مگر اس کی سانسوں تک کی آواز نہیں آئی۔

گھنٹے بعد وایس میسیج میں راضی کی لرزتی ہوئی آواز میں الفاظ کٹ کٹ کے سنائی دے رہے تھے؛ باغ کے اندھیرے میں اسی سمبل کے درخت کے نیچے کھڑا ہوں جہاں، من بھاتی عورت کی دو حسین آنکھیں ملیں کہ اپنا ہوش ہی کھو بیٹھا، ابھی اوسان خطا ہیں کہ یہ آنکھیں کسی اور کے لیے چمک رہی تھیں تو پھر میں کیسے اس چمک کا اسیر ہوگیا؟

اس کا الجھاؤ سویرا سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ سویرا کی آنکھوں کے سامنے دنیا دھندلی ہونے لگی، مشکل سے خود کو سنبھال کے ہیجان خیز آواز میں آخری ضرب لگا دی: یاد کرو تم مجھ سے اپنی چاہت کا اظہار کرتے ہوئے ساتھ ساتھ یہ بھی کہتے رہے کہ پندرہ نومبر کو میں نے اپنے آپ سے یہ وعدہ کیا کہ سویرا سے آخری سانس تک محبت کرتا رہوں گا۔ کرتے رہو گے نا!

□□□

Dr. Wafa Yazdan Manesh
Associate Prof.
University of Tehran
44 Nateqi, Niro E, Daryei
ST. Resalat
SQ. Tehran(Iran)

مقابلہ

ڈاکٹر طلعت فاطمہ

انسانوں کا مجمع ایک لمبی قطار کی شکل میں کسی انجانی مسافت پہ جانے کے لیے بےقرار و بےتاب نظر آ رہا تھا۔ یہ مجمع نوجوان نسل کا تھا جو دو بارعب ادھیڑ شخصیات کے پیچھے بھیڑ چال کی مانند چلا جا رہا تھا۔ اس مجمع میں کئی حاملہ خواتین بھی تھیں اور کئی خواتین نوزائیدہ بچوں کو گود میں لیے طویل راستے پہ تپتی دوپہر میں بھوک پیاس سے بے نیاز بس منزل کی طلب میں آگے اور آگے بڑھنے کو بے چین تھیں۔ مجمع میں بیشتر نوجوان لڑکیاں اور لڑکے شامل تھے اور بس ہر کوئی کسی نہ کسی طرح اس کرب ناک سفر کے ختم ہونے کا متمنی تھا کیوں کہ اس مجمعے کے دو رہنماؤں کے مطابق جو اس طویل سفر بالفاظ دیگر مقابلے میں آخر تک بنا رہے گا اُسے اچھا عہدہ اور پُر آسائش زندگی بطور انعام ملے گی۔ دونوں رہنما چوں کہ شاہی سواری پہ براجمان تھے اس لیے انھیں سفر کی مشکلات کا احساس نہیں ہو رہا تھا لہٰذا وہ پُر پیچ راستوں سے اس قافلے کو منزل کی اُور لے جا رہے تھے تا کہ اس اذیت بھرے سفر سے اُکتا کر بہت لوگ ہتھیار ڈال دیں۔ یہ بھی حقیقت تھی کہ اس مشکل سفر پہ چلنے کے لیے کسی کو مجبور نہیں کیا گیا تھا بس اخبار میں ایک چھوٹا سا اشتہار دے دیا گیا تھا اور اسی بنا پہ نوجوانوں کی اچھی خاصی تعداد جمع ہو گئی۔ اس لیے اس تعداد کو مطلوبہ نتائج تک پہنچانے کے لیے مقابلے کی سختی لازمی تھی۔ رہنماؤں کی تدبیر کام کر گئی اور کئی امیدواروں نے اپنے پاؤں شل ہو جانے کی وجہ سے ہاتھ کھڑے کر دیے ان میں زیادہ تعداد اُن خواتین کی تھی جو حاملہ تھیں اور جن میں سے کچھ کا حمل اس تکلیف دہ سفر سے ضائع بھی ہو گیا تھا سو وہ اس درد کو برداشت نہ کرتے ہوئے مقابلے سے باہر ہو گئیں۔ اب مجمعے میں وہ خواتین بچی تھیں جو اپنے بچوں کو گود میں اٹھائے تھیں یا ان کی انگلی تھامے سست روی سے منزل طے کر رہی تھیں۔ نوجوان لڑکے بھی بوڑھوں کی طرح خمیدہ کمر اور شکستہ پا نظر آ رہے تھے۔

چلتے چلتے وہ قافلہ ایک صحرا میں پہنچ گیا۔ حدِ نگاہ تک بس ریت کے اونچے اونچے ٹیلے تھے اور اس تپتی ریت پہ چلنا بھی ایک مشکل امر تھا۔ ماؤں نے فوراً سے پیشتر اپنے جگر گوشوں کو گود میں اٹھا لیا جس کے سبب ان کا بوجھ مزید بڑھ گیا اور چال بھی بہت سست ہو گئی نیتجتاً ان میں سے چند مائیں قافلے سے بہت پیچھے رہ گئیں اور بالآخر وہ راستہ بھٹک گئیں۔ تپتی ریت، بھوک پیاس کی شدت اور معصوم بچوں کی دل فگار چیخ سے ان کا دماغ ماؤف ہونے لگا۔ اب اُن میں اتنی بھی سکت باقی نہیں تھی کہ وہ واپسی کی راہ ڈھونڈ پاتیں۔ ان کے قدم وہیں لڑکھڑا گئے اور وہ صحرا ہی ان کی آخری آماجگاہ بن گئی۔ اب دھیرے دھیرے سورج غروب ہو رہا تھا اور قافلے میں امیدواروں کی تعداد بھی گھٹ رہی تھی۔ جب سورج غروب ہو گیا اور سرمئی شام نے اپنے پر پھیلائے اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چلنی شروع ہوئیں تو باقی ماندہ مسافروں نے چین کی سانس لی۔ اب اُن دونوں لیڈران نے تمام امیدواروں کو اطلاع دی کہ "ہماری منزل آ گئی ہے" اور اس اطلاع کے ساتھ ہی قافلے میں موجود بیس لوگوں کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ لیکن ایک امتحان ابھی مزید باقی تھا کیوں کہ لوگ بیس تھے اور عہدہ صرف ایک لہٰذا آخری مرحلہ یہ رکھا گیا کہ ایک چھوٹی سی چہار دیواری کے اندر ان بیس لوگوں کو اس وقت تک رہنا تھا جب تک رہنماؤں کا نیا حکم جاری نہ ہو جاتا۔ حکم کی تعمیل کرتے ہوئے سبھی امیدوار اس چھوٹے سے اندھیرے کمرے میں کسی طرح سما گئے۔ اب آگے جو صورت حال ہونے والی تھی وہ امیدواروں کے لیے خلاف توقع تھی۔

ابتداء میں تھوڑی دیر تک تو وہ سب پُرسکون رہے لیکن دھیرے دھیرے ان کو گھٹن کا احساس ہونے لگا کیوں کہ ایک تو جگہ کافی تنگ تھی اور دوسرے اندھیرے نے وحشت کو مزید بڑھا دیا تھا۔ لوگوں کے شانے آپس میں ٹکرانے کی وجہ سے چھلنے لگے تھے۔ ان بیس لوگوں میں اب صرف ایک

ایسی امیدوار بچی تھی جو اپنے ننھے لخت جگر کو گود میں لیے کھڑی تھی اور ساتھ ایک نوجوان لڑکی بھی اس تنگ کمرے میں موجود تھی۔ باقی سبھی نوجوان لڑکے اور مرد حضرات تھے۔ بچہ اس حبس زدہ ماحول سے پریشان ہو کر بے تحاشہ رو رہا تھا جو باقی ماندہ امیدواروں کے لیے مزید بیزاری کا سبب بن رہا تھا۔ لوگ اس عورت کو برا بھلا کہہ رہے تھے اور اسے اپنے بچے کو چپ کرانے کو بول رہے تھے وہ عورت بچے کو بہلانے کی کوشش کر کر کے تھک چکی تھی اور اب بے بسی سے لوگوں کے کٹیلے الفاظ سننے کے لیے مجبور تھی۔ کتنے لمحے گزرنے کے بعد بھی جب کوئی امیدوار ہار ماننے کو تیار نہیں ہوا تو رہنماؤں نے نئی تدبیر ڈھونڈی اور اسی کے پیش نظر کمرے کی چھوٹی سی نالی سے کثیف اور ٹھنڈا پانی کمرے میں داخل ہونے لگا۔ لوگوں کو جب اپنے پاؤں گیلے ہونے کا احساس ہوا تو سب ہی حواس باختہ ہو گئے۔ پانی میں بدبو بھی بہت زیادہ تھی۔ کچھ لوگ اس ناگوار بُو کی تاب نہ لا کر کمرے کا دروازہ پیٹنے لگے اور بالآخر وہ مقابلے سے باہر ہو گئے۔ اب کمرے میں موجود لوگوں کی کمر تک پانی کی سطح پہنچ گئی۔ وہ عورت اب بھی کمرے میں موجود تھی اس نے اپنے بچے کو اپنے کاندھے پہ بٹھا لیا تاکہ بچہ ٹھنڈے پانی سے محفوظ رہے۔ وہ یہ موقع گنوانا نہیں چاہتی تھی کیوں کہ بہت مشکل سے وہ اس آخری پڑاؤ تک پہنچی تھی اور اب یہ مقابلہ اسے ہر حال میں جیتنا تھا۔

پانی کی سطح اب امیدواروں کے سر تک پہنچ چکی تھی۔ سب لوگ بے چین ہونے لگے۔ عورت اور اس کا بچہ بھی مکمل پانی میں ڈوب گئے مگر عورت اپنے بچے کو سینے سے چمٹائے اب بھی دعا کر رہی تھی کہ باقی لوگ اس کمرے سے نکل جائیں اور وہ یہ مقابلہ جیت جائے۔ اس کا بچہ اب بے سدھ ہونے لگا تھا اور وہ اس حقیقت سے بیگانہ اس کے بہتر مستقبل کے خواب سنجو رہی تھی۔ اچانک اسے اپنے بچے کی حرکت قلب بند ہونے کا احساس ہوا اور وہ دیوانہ وار دروازہ بجانے لگی۔ اس کے ساتھ ہی اور بھی کئی لوگ پژمردہ حالت میں کمرے سے باہر نکل گئے۔ اب اس تنگ کمرے میں صرف پانچ لوگ رہ گئے تھے جن میں وہ نوجوان لڑکی بھی تھی۔ وہ یہ مقابلہ کسی بھی قیمت پہ جیتنا چاہتی تھی چاہے اسے اپنی جان ہی کیوں نہ گنوانی پڑے۔ وہ یہ ثابت کرنا چاہتی تھی کہ لڑکیاں بھی ہر حالات کا سامنا کر سکتی ہیں اور مردوں کو پچھاڑ سکتی ہیں۔

جب پانی کی سطح امیدواروں کے سروں سے بھی تجاوز کر گئی تو باہر سے ایک نقارے کی آواز کے ساتھ مقابلے کے اختتام پذیر ہونے کی اطلاع ملی۔ کمرے کا دروازہ کھول دیا گیا اور پانچوں لوگ پانی کے بہاؤ کے ساتھ بہتے ہوئے باہر آ گئے۔ تین لوگ تو بے ہوش ہو چکے تھے اور دو لوگ جن میں ایک لڑکا اور وہ لڑکی رہ گئے تھے وہ وہیں کمرے کے باہر گندے اور گیلے کپڑوں میں نقاہت سے پڑے رہے۔ اب انہیں یہ آخری حکم دیا گیا کہ ان دونوں میں سے جو بھی امیدوار سب سے پہلے وہاں سے کچھ فاصلے پہ موجود گھوڑے پہ چڑھ کر اس کی لگام تھام لے گا وہی اس مقابلے کا فاتح کہلائے گا۔ وہ دونوں پورے جوش سے دوڑنے کے لیے اٹھے لیکن وہ لڑکی وہیں لڑکھڑا گئی کیوں کہ اس کے پاؤں بے جان اور مفلوج ہو چکے تھے۔ بہت کوشش کے باوجود بھی وہ اپنی جگہ سے ہل نہیں پائی۔ جیت اس کے اتنے قریب تھی لیکن وہ وہاں پہنچنے سے قاصر تھی۔ بے بسی کے آنسو اس کے گندے اور بدبودار کپڑے میں پیوست ہونے لگے اور اس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ بالآخر وہ نوجوان کسی طرح اس گھوڑے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا اور جیسے ہی اس گھوڑے پہ چڑھنے کی اُس نے کوشش کی تو اسے احساس ہوا کہ اس کا ہاتھ تو شل ہو چکا ہے اور اس میں کوئی حرکت نہیں ہو رہی۔ وہ کسی طرح اپنے جسم کے سہارے گھوڑے پہ چڑھ تو گیا لیکن لگام کھینچنے سے محروم رہ گیا۔

دونوں لیڈران ایک دوسرے کی جانب معنی خیز نظروں سے دیکھ کر مسکراتے ہوئے اپنی جیبوں کو تھپتھپانے لگے اور اپنے لہجوں میں نہایت افسردگی سمو کر انھوں نے مقابلے کے ناکام نتائج کا اعلان کر دیا۔ اب انھیں اس منصب کی خانہ پُری کے لیے نئے امیدواروں کی تلاش شروع کرنی تھی سو ایک بار پھر انھوں نے ایک نئے شہر کا رخ کیا اور وہاں کے مقامی اخباروں میں اپنے اس انوکھے مقابلے اور اس میں حاصل ہونے والی مراعات کے اشتہارات دلوائے اور اب اس مقابلے میں شامل ہونے کے لیے داخلے کی رقم بھی پہلے سے دُگنی کر دی گئی۔ صبح لوگوں کی نظریں جب اخبار کے اس اشتہار پر پڑیں تو ان کے چہرے پہ ایک الگ سی سرشاری جھلکنے لگی اور ایک عزم منعکس ہونے لگا اور لوگوں کا ہجوم اپنی محنت کی گاڑھی کمائی سے مطلوبہ رقم لے کر ایک لمبی قطار کی شکل میں مقابلے میں حصہ لینے کے لیے پہنچ گیا!!!

□□□

Dr. Talat Fatma
1,Topsia Road (South)
Kolkata-700046
Email:talatfatma04@gmail.com
Cell:9903786723

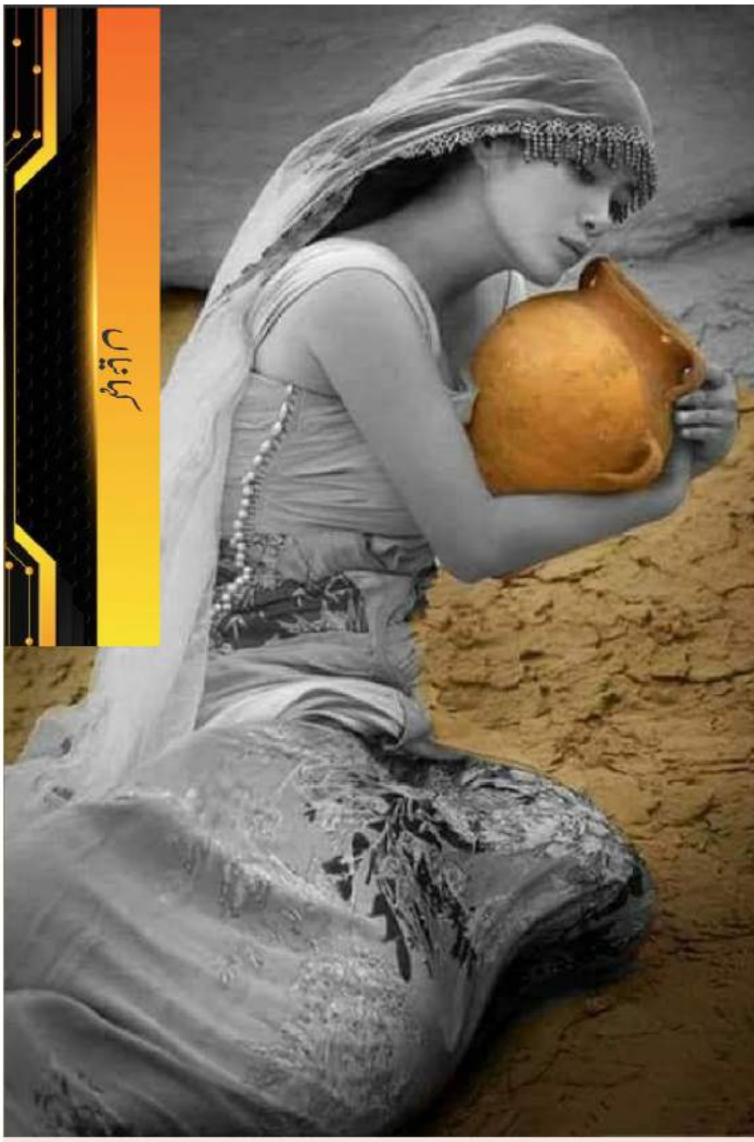

مورت

صاعقہ غیاث

لوگوں کا آنا جانا کثیر تعداد میں جاری رہا میں بھی اپنے بچوں اور اہلیہ کے ہمراہ داخل ہوا۔ میرج ہال کا دروازہ رنگ برنگے مصنوعی پھولوں سے سجایا گیا تھا، روشنی کا انتظام بھی مخصوص ڈھنگ سے کیا گیا تھا سب کچھ آنکھوں کو کتنا بھلا بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ دروازے کے دونوں اطراف قبائلی طرز کی دو مورتیاں ہاتھوں میں بھالے لیے کھڑی تھیں۔

" تراشنے والے نے غضب کی فنکاری دکھائی ہے جیتے جاگتے انسان کی نقل ۔۔۔۔۔ بھائی واہ! کمال ہے اور سجاوٹ کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔" میری زبان سے بے ساختہ نکلا۔

" ہاں ۔۔۔۔ واقعی خوبصورت ہے۔۔۔" میری بیگم نے جواب دیا۔ اب بچے بھی ان مورتیوں کو قریب سے دیکھنے کی چاہ میں تیز تیز آگے بڑھنے لگے مگر فوراً ہی واپس پلٹے ۔شاید ڈر گئے تھے، سہم کر اپنی ماں سے لپٹ گئے ۔ میں نے دونوں کو گود میں اٹھالیا ہم اندر داخل ہوئے ۔ خوشنما لباس ، ہاتھوں میں تحائف اور لبوں پر تبسم سجے ہوئے چمکتے چہروں کے درمیان اب ہم بھی نظر آنے لگے۔ میں نے ایک نظر اپنی اہلیہ کو سرتا پا دیکھا۔

" بیگم اس دفعہ آپ کے ساتھ ہماری بات بھی صحیح ثابت ہوئی۔۔۔ ٹھنڈ تو ہے، بھلے ہی عورتیں اپنے زیورات اور کپڑوں کی نمائش میں اسے محسوس نہ کریں۔۔۔۔ اب ایک نظر مرد حضرات پر ڈالیں۔۔۔۔ اگر ابھی کوئی انہیں کمبل پیش کرے تو ہرگز انکار نہ کریں گے۔۔۔۔" میں تمسخر آمیز انداز سے بولا ۔ میرے ساتھ بچے بھی ہنسنے لگے ۔ میری بیوی اپنی ساڑی ٹھیک کر رہی تھی اس نے میری طرف دھیان نہیں دیا۔ یا شاید محفل کے شور کی وجہ سے اس نے میری باتیں نہیں سنیں ۔ وہ بنارسی ساڑی میں آج بڑی جاذب لگ رہی تھی ۔ اگلے ہی لمحے اس کی نگاہ اپنی عزیز سہیلی پر پڑی اور وہ دونوں گفتگو کرنے لگیں۔

جاڑے میں سرد ہواؤں کا عذاب کتنا ہی سخت کیوں نہ ہو، عورتیں اور وخاص طور پر لڑکیاں اپنے بناؤ سنگھار کے آڑے کچھ بھی آنے نہیں دیتیں ۔ دوسری طرف ہم مردوں کو گرم کپڑوں میں بھی عدم تحفظ کا خوف ستاتا رہتا ہے اور ہم اپنے گلوبند کو بار بار انداز بدل بدل کر باندھتے رہتے ہیں یا اپنی ٹوپیوں کو کھینچ کھینچ کر خود کو سرد ہواؤں سے محفوظ رکھنے کی کوششیں

کرتے ہیں۔

دوستوں کی ٹولی پہلے ہی جمع ہوچکی تھی نظر پڑتے ہی وہ مجھے بھی اپنے ساتھ کھینچ کر دوسری جانب لے جانے لگے تو میں نے بچوں کو ان کی ماں کے حوالے کیا اور ضرورت پڑنے پر کال کرنے کی تاکید کرتے ہوئے نکل آیا۔ یاروں کی محفل آج پھر لگ گئی پھر سے پرانا جوش وجود میں اٹھنے لگا۔

شاداب ہمارے گروپ کا وہ واحد لڑکا تھا جس کی شادی اب تک نہیں ہوئی تھی۔ آج ذمہ داریوں کی بیڑیاں اسے بھی لگ گئیں۔ شاندار انتظام کیا گیا تھا اور ہوتا بھی کیوں نہ بڑا بزنس مین بن کر بیچارہ کب سے در بدر دلہن کی تلاش میں تھا آخر صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ اس کوئے کے نصیب میں کانچ کی سی خوبصورت گڑیا آئی جسے مزید سجا سنوار کر اپسرا بنا دیا گیا تھا۔ خاص دوستوں کے لیے انتظامات بھی خاص کیے گئے تھے۔ اسٹال سے سج کر پلیٹوں میں رس ملائی، پکوڑے، چکن پکوڑے، سافٹ ڈرنکس، چاٹ، کافی، کٹ لیٹ، پنیر پکوڑے اور پان الگ سے کمرے میں آتے رہے اور ہم سب نے خوب انجوائے کیا۔ جا بجا بڑے اسکرین والے ٹی وی لگے ہوئے تھے جن پر باری باری ہلدی، مہندی، بارات اور نکاح کے ساتھ شادی کے دیگر رسومات کی تصویریں اور وڈیو دکھائے جا رہے تھے۔ گانے کا انتظام میرج ہال کے مرکزی ہال میں کیا گیا تھا۔ جگہ بھی بڑی تھی اس احاطے کو ربن اور رنگین کپڑوں سے سجایا گیا تھا ہم سبھی یہاں چلے آئے۔ گلوکار و گلوکارہ کے گیت من کو موہ رہے تھے۔ بالی ووڈ کے مشہور کلاسکی نغموں سے ہم بھی لطف اندوز ہونے لگے۔ ہماری فرمائش پر انھوں نے دوستی کے ترانے بھی گائے۔ دوستانہ جذبات امڈ آنے پر ہم سبھی اپنے پرانے دنوں میں لوٹنے لگے تو ساتھ گیت کے بول گانے لگے۔ چونکہ ہال کا اوپری حصہ زیادہ تر کھلا ہوا تھا مجھے گرتے ہوئے شبنمی قطروں سے بچوں کا خیال آیا کہ ان کی ماں کو آج ٹھنڈ لگے نہ لگے لیکن بچوں کے لیے یہ نقصان دہ ثابت ہوسکتا ہے۔ بڑی مشکل سے اجازت لے کر اپنے ساتھیوں کے درمیان سے نکلا اور محترمہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ دلہن کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ بچے اپنے ہمجولیوں کے ساتھ بھاگ دوڑ میں لگے تھے۔ کھانا کھا کر گھر لوٹنے سے پہلے ہم شاداب کے پاس طلب اجازت کی غرض سے پہنچے۔ کیمرہ مین ہر زاویے سے دلہن دولہے کو کیمرے میں قید کر رہا تھا، میری فیملی بھی شامل ہوگئی بچے اپنی نئی آنٹی کے ساتھ تصویریں بنانے لگے، میں اور میری اہلیہ بھی گروپ فوٹو میں شامل ہوگئے۔ باہر آتے ہوئے گیارہ بج گئے۔ بچے باہر پھولوں سے سجے بڑے دروازے کے پاس آتے ہی تصویریں لینے کی ضد کرنے لگے۔

میں بھی سبھوں کے ساتھ سیلفیاں لینے لگا۔ مجھے اپنی بیٹی پر حیرت ہو رہی تھی وہ دلہن کی نقل اتارتے ہوئے شوق سے تصاویر کھینچوا رہی تھی پھر میری تصویریں بھی نکالنے لگی۔ مجھے اپنی بیٹی کے معصومانہ انداز پر بہت پیار آ رہا تھا۔ لوگ بھی جاتے ہوئے مسکرا کر دیکھ رہے تھے۔

میں دروازے کے پاس اس قبائلی مورت کے نزدیک مخصوص ڈھنگ سے کھڑا ہو گیا دو تین تصویروں کے بعد میں مورت کے اور بھی قریب ہوا تو میری نظر اس مورتی کی نگاہوں پر پڑی، اس کی آنکھوں کی پتلیاں حرکت کر رہی تھیں۔ میں ڈر کر کچھ پیچھے ہوا۔ پھر قریب جا کر بغور جائزہ لینے پر اندازہ ہوا کہ یہ کوئی مورت نہیں بلکہ جیتا جاگتا انسان ہے۔ میں حیرت انگیز کیفیت میں چند لمحے بتلا رہ کر پھر حقیقی دنیا میں لوٹ آیا۔

یہ دونوں نہ جانے کتنے گھنٹوں سے یہاں اسی حالت میں کھڑے ہیں۔ انھوں نے براق دھوتی پہن رکھی تھی اور اسی طرح کے چمکیلے رنگ سے پورے بدن کو بھی پینٹ کر رکھا تھا۔ نقلی بال اور مونچھیں وہ سانس بھی اس انداز سے لے رہے تھے کہ سانسوں کے زیر و بم سے جسم پر ہونے والی حرکت کا اندازہ لگا پانا مشکل تھا۔ یہ دونوں لوہے سے بنے مستطیل نما چپٹے ڈبے پر کھڑی تھیں۔ جسم کی بناوٹ سے اندازہ ہوا کہ ان کی عمر بھی زیادہ نہیں۔ وہ دبلے پتلے ٹھیک کسی مجسمے کی طرح ہی معلوم ہو رہے تھے۔ میرے غور سے دیکھنے کے بعد، ان میں سے ایک کے چہرے سے رنگ غائب ہونے لگا جیسے وہ اب کسی کی نظر میں آ گیا ہو۔ اسے اپنی اس حالت پر رنج کے ساتھ ساتھ شرمندگی کا بھی احساس ہونے لگا۔ میں نے دیکھا اس کے ہونٹ بھی ہلے لیکن وہ ہنسی نہیں تھی۔ وہ تو مکھوٹا تھا جس کے پیچھے وہ خود کو سمیٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس کی بیچارگی چہرے سے صاف عیاں ہو رہی تھی، گویا وہ رونے کے قریب ہوا اور آنسو کا ایک قطرہ بہہ کر ابھی سارے رنگوں کو دھو ڈالے گا، پھر سب کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ ایک زندہ آدمی ہے۔ پھر یوں ہوا اس کے اشک واپس آنکھوں کے رستے دل میں لوٹ گئے۔ اب اس کے چہرے پر طمانیت کے نقوش ابھرنے لگے۔ منظر اچانک بدلنے لگا اب وہ مجھے اسی بیچارگی اور ترس کھاتی نگاہوں سے دیکھنے لگا جس سے کچھ دیر پہلے تک میں اسے دیکھ رہا تھا۔ جوں ہی یہ محسوس ہوا، مجھ میں اپنے رتبے کے برابر غرور آ گیا۔ میں نے مڑنے سے پہلے دیکھا، اس کے ہونٹوں نے ذرا بھی حرکت نہ کی لیکن وہ مجھ پر ہنس رہا تھا۔

خفت کے احساس سے ہمت نہ ہوئی کہ اس سے ایک لفظ بھی پوچھ سکوں، میں خاموشی کے ساتھ بچوں کا ہاتھ پکڑ کر کار کی طرف جانے لگا۔ کار کی جانب

اٹھتا میرا ہر قدم میرے دل میں ایک ساتھ کئی سوال پیدا کر رہا تھا۔

" اشرف المخلوقات نے کتنی ترقی کر لی ہے، رتبہ، اسٹینڈرڈ اور کیا کچھ نہیں حاصل کر لیا ہے اس نے، پھر انسان ہونے کے ناطے انسانیت کے میدان میں وہ اب تلک اتنا کیوں پسماندہ ہے؟ اس میں انسانیت کا تناسب آخر کیوں کر کم ہو گیا ہے؟ اور میں ۔۔۔ ہاں میں بھی تو صاحب حیثیت ہوں پھر میں نے اس کی مدد کیوں نہیں کی ۔۔۔۔۔ میں نے تو ان کی نگاہیں پڑھ لی تھیں ۔۔۔۔ ان کی اصل پریشانی جاڑے کے اثر سے ہونے والی درگت سے بھی کہیں زیادہ تھی ۔۔۔۔۔ پھر میری زبان کیوں نہیں کھلی؟ نہ قدم رکے؟ کہیں میں انسان سے اب صرف مٹی کی مورت تو نہیں رہ گیا۔؟ مجھے محسوس ہوا کہ میں اندر سے خالی ہو گیا ہوں۔

" پاپا ۔۔ پاپا ۔۔۔۔ کیا وہ مورتی نہیں، میں نے دیکھا اس کی آنکھیں ہل رہی تھیں" کار کی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے میرے بیٹے نے پوچھا۔

"نہیں بیٹا وہ مورتی نہیں تھی ۔۔۔۔ وہ خالص انسانی صورت میں مفلسی کی مورت تھا " میرے جواب کے بعد خامشی کا سیلاب اٹھا جس کے حصار میں گیتوں اور نغموں کے وہ بول جواب تک یہاں پہنچ رہے تھے کہیں کھو گئے اور کار کی رفتار تیز ہو گئی۔

□□□

Saiqa Gayas
MR/49 Masjid Mohallah Benachity
Durgapur-13
Post: Benachity
Dist:paschim Burdwan-713213 (W.B)
Mob:7001861188
E- mail:saiqagayas308gmail.com

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا رکی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر.......................... بتاریخ..........................

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِ تعاون سالانہ -/100 روپے A/C: 90092010045326، IFSC:CNRB0019009 میں جمع کروا دیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون:011-26109746 فیکس:011-26108159, E-mail:magazines@ncpul.in

دستخط

دانت کا درد

(وجع الاسنان)

عام طور پر یہ درد دانت کے جوہر میں ہوتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی اُس عصب میں ہوتا ہے جو اس کی جڑ میں واقع ہے۔ اس کے علاوہ بعض اوقات اصل مرض مسوڑھے میں ہوتا ہے اور دانت میں محسوس ہونے لگتا ہے۔

اس کا سبب یا تو گرم یا سرد مزاج سادہ ہوتا ہے یا دانت کو پوری غذا نہ ملنے کی وجہ سے اس میں خشکی پیدا ہو جاتی ہے اور درد پیدا کر دیتی ہے، یا کوئی سوءِ مزاج مادی اس کا موجب ہوتا ہے۔ ریاح بھی دانت میں درد پیدا کر دیتے ہیں۔ سوءِ مزاج مادی کی صورت میں یا تو اپنی کثرت کی وجہ سے باعث درد ہوتا ہے یا اپنے غلظ کی وجہ سے اور اپنی حدت اور تیزی کی وجہ سے درد پیدا کرتا ہے۔ یہ مادہ کبھی تو سر سے دانتوں کی طرف گرتا ہے اور کبھی معدے سے صعود کرتا ہے اور بعض اوقات دونوں طرف سے بیک وقت آ کر درد پیدا کرتا ہے۔

کبھی اس کا سبب دانت میں کیڑا لگنا ہوتا ہے مرکبات سیماب کا استعمال۔ نقرس، وجع المفاصل اور آتشک کی سمیت برف اور ترش اشیا کا استعمال بھی اس کے اسباب جالبہ میں سے ہیں۔

علامات

اگر دانت کے درد کے ساتھ مسوڑھے میں بھی ورم ہو یا مسوڑھے کو دبانے سے مریض کو تکلیف کا احساس ہوتا ہو تو سمجھ لینا چاہیے کہ سبب مرض دانت میں نہیں ہے بلکہ مسوڑھے میں ہے۔ اگر مسوڑھے میں ورم وغیرہ نہ ہو تو سبب مرض خاص دانت میں ہے یا اُس عصب میں ہے جو اِس کے نیچے واقع ہے۔

دونوں میں امتیاز کرنے کے لیے ایک تو دانت کو غور سے دیکھیں اور دوسرے درد کی نوعیت پر غور کریں۔ چنانچہ اگر دانت متورم معلوم ہو اور دانت کا درد پوری لمبائی میں محسوس ہو تو یقین کر لینا چاہیے کہ خاص دانت ہی ماؤف ہے۔ اور اگر دانت متورم نہ ہو، نیز درد دانت کی جڑ کی گہرائی میں محسوس ہو تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ درد کا سبب عصب کے اندر ہے۔

سوءِ مزاج گرم سادہ میں غلبۂ حرارت (گرمی) کی علامتیں اور سوءِ مزاج سرد میں غلبۂ برودت (سردی) کی علامتیں پائی جائیں گی۔ اگر سوءِ مزاج مادی ہے تو مادہ غالب کی علامتیں نمایاں ہونگی۔ خشکی کی صورت میں دانت لاغر معلوم ہوگا۔

ریحی کی خاص علامت یہ ہے کہ درد کے ساتھ تمدّد کا احساس ہوگا نیز درد ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا رہے گا۔

خلط کا مبدا متعین کرنے کے لیے معدے اور دماغ کے حالات کا مبدا ہوگا۔ اسی میں امتلا کی علامتیں موجود ہوں گی۔

اگر دونوں جگہ سے بیک وقت مادّہ پہنچ رہا ہے تو دونوں میں امتلائی کیفیت پائی جائیں گی۔

سبب مرض کا اصل محل بعض اوقات دانت اکھڑنے سے بھی متعین ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جب سبب درد مسوڑھے میں ہوتا ہے تو دانت کے اکھڑنے سے مریض بالکل اچھا ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر سبب دانت کے عصب میں ہوتا ہے تو محل مرض متعین نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ اس صورت میں کبھی تو دانت کے اکھڑنے سے درد بالکل زائل ہو جاتا ہے اور کبھی بدستور رہتا ہے۔

علاج

سوءِ مزاج گرم میں حسب ضرورت قیفال کی فصد کھولیں۔ ہلیلہ اور تمر ہندی کے جوشاندے سے اسہال لائیں۔ گلاب خالص اور سرکہ ملا کر مریض کو کلیاں کرائیں۔ اگر درد بہت شدید ہو تو قدرے کافور بھی شامل کر لیں۔ اس کے بعد صرف روغن گل سے کلی کرائیں۔ اگر درد بہت شدید ہو اور تنہا روغن گل کافی نہ ہو تو اس کے ساتھ تھوڑی افیون بھی شامل کریں۔

سوءِ مزاج میں ایارجات وغیرہ سے مادے کا تنقیہ کریں۔ سرکہ میں پودینہ خشک عاقر قرحا اور صعتر فارسی وغیرہ جوش دے کر کلیاں کرائیں نیز عاقر قرحا، بورۂ ارمنی، زنجبیل، فلفل سیاہ، شیطرج ہندی وغیرہ ادویہ کو باریک کوٹ چھان کر بطور منجن دانتوں کی جڑوں پر ملیں۔ نمک یا بھوسی کی پوٹلی یا صرف گرم کپڑے سے ماؤف جبڑے کی سینک کریں۔

امتلا معدہ کی صورت میں معدے کا تنقیہ کریں اور مریض کو غذا بہت کم دیں۔ درد دندان ریحی میں دماغ کا رطوبات سے تنقیہ کریں۔ دانتوں پر منجن اور محلل دوائیں مثلاً فلفل سیاہ، پوست بیخ کبیر، گوند اور شہد خالص وغیرہ۔

اگر سبب مرض خشکی ہو تو مرطب تدابیر عمل میں لائیں۔ دانت پر مکھن اور چربی بط وغیرہ ملیں۔ سبب مرض دانت کے کیڑے ہوں تو ایسی ادویہ استعمال کریں جو ان کو مار ڈالیں۔ مثلاً

تخم گندنا، بزرالبنج تخم پیاز وغیرہ کو باریک کر کے موم یا بکری کی چربی میں ملا کر انگاروں پر جلائیں اور کسی نلکی کے ذریعہ سے ان کا دھنواں دانتوں کو پہنچائیں۔

منتخب اور مجرب نسخے

1 یہ دوا دانتوں کے درد میں سکون بخشتی ہے۔

عاقر قرحا	12 گرام
کافور خالص	3 گرام

دونوں کو باریک کر کے دانت کی جڑ پر لگائیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد تین چار بار لگائیں۔

2 سنون (منجن)

یہ منجن دانتوں کی رطوبت اور فضلات کو خارج کر دیتا ہے اور درد میں سکون بخشتا ہے۔

عاقر قرحا، شب یمانی بریاں ہر ایک 12 گرام۔

سب کو کوٹ چھان کر منجن تیار کریں اور وقت ضرورت ماؤف دانتوں پر لگا کر رال بہا دیں۔ دن میں دو تین مرتبہ حسب شدّتِ دَرد لگا سکتے ہیں۔

3 منجن

عاقر قرحا، فلفل سیاہ، نوشادر ہر ایک 12 گرام، کافور خالص ایک گرام۔

سب کو باریک کر کے شیشی میں ڈال لیں وقت ضرورت اس میں سے تھوڑا سا دانتوں پر ملیں درد میں فوراً کمی ہو جائے گی۔

4 نسخہ عطوس

یہ نسخہ دانتوں کے درد کے لیے مجرّب ہے۔

نوشادر 12 گرام، کافور خالص ایک گرام۔

دونوں کو باریک کر کے رکھ لیں اور وقت ضرورت اس کی تھوڑی سی نسوار سے دانت اور داڑھ کا درد فوراً ساکن ہو جاتا ہے۔

5 نسخہ برائے درد دنداں

یہ نسخہ بھی درد کے لیے بہت کامیاب ہے۔

عاقر قرحا، زیرہ سفید، فلفل سیاہ، نمک لاہوری، نوشادر، اجوائن دیسی ہر ایک تین گرام۔

شب یمانی بریاں، کوڑی زرد سوختہ ہر ایک نصف گرام، افیون سوختہ 500 ملی گرام۔

سب کو کوٹ چھان کر محفوظ کر لیں اور ضرورت کے وقت اس میں سے تھوڑا لے کر دانتوں میں ملیں۔ بے حد مفید اور مسکن ہے۔

6 مضمضہ

یہ مضمضہ دانتوں کے درد میں تسکین بخش ہیں۔

فلفل سیاہ 3 گرام، پھٹکری سفید 3 گرام

عاقر قرحا 3 گرام، بزرالبنج 3 گرام

پوست خشخاس 6 گرام، چھال کیکر 12 گرام

سب کو ایک لیٹر پانی میں جوش دیں۔ پھر پانی کو چھان کر اس سے غرغرہ کریں۔

7 بخور

یہ بخور دانتوں کے درد میں فوراً سکون بخشتا ہے۔

عنب الثعلب خشک کو انگاروں پر جلا کر کسی نلکی کے ذریعہ سے دھواں دانتوں تک پہنچائیں۔ درد میں فوراً سکون ہو جائے گا۔

اسی طرح دن میں دو تین بار کرنے سے مکمل صحت ہو جاتی ہے۔

□□□

(بحوالہ: درد علامت اور علاج، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، سنہ اشاعت 2002)

مراسلہ

خواتین دنیا مئی 23 کا شمارہ ملا۔ شکریہ!

اس بار عشرت ناہید کی کہانی "دوسری ردا" خاص توجہ کی چیز ہے۔ کس طرح اس کی ہیروئن اپنے گھر والوں کی خودغرضی اور بے حسی کی شکار ہوتی ہے۔

اس پس منظر میں اپنی حفاظت کی ذمہ داری صرف لڑکیوں پر نہیں بلکہ تمام اہل خانہ کی ہے۔ اپنی بے حسی اور خودغرضی پر غور کرنے کی ضرورت ہے اور میں سمجھتا ہوں یہی اس کہانی کا مقصد بھی ہے۔

میں مصنفہ کو اس بروقت الارم کے لیے مبارک باد دینا چاہتا ہوں۔

فیروز احمد، تاتلہ لین، کولکاتہ۔

امید ہے آپ خیر و عافیت سے ہوں گے آپ کا ماہنامہ خواتین دنیا' مارچ 2023 کا شمارہ بڑی آب و تاب کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ اس میں بہت ہی معلوماتی مضامین کا شمار کیا گیا ہے جو پڑھنے والوں کی معلومات میں اضافہ کرتے ہیں۔

سائنس نامہ، ننھے فنکار، ڈاک خانہ، تعلیم نسواں بہت بہتر ہے لیکن مجھے سب سے بہتر مضمون ''صفی اورنگ آبادی'' کا لگا ان کی زندگی کا احاطہ بڑی خوبصورتی کے ساتھ اس مضمون میں کیا گیا ہے جیسے سمندر کو کوزے میں بند کر لیا گیا ہو۔ ان کا بچپن، زندگی اور شاعری کو مصنفہ نے بڑی ہی خوبی سے بیان کیا اور ساتھ ساتھ بہتر سے بہتر اشعار منتخب کر کے مضمون کی رونق دوبالا کردی۔

دل کی عمیق گہرائیوں سے آپ کو اور مصنفہ ڈاکٹر شاہین فاطمہ کو مبارکباد پیش کرتی ہوں۔ آپ اس طرح کے معلوماتی مضامین اپنے رسائل میں شائع کر کے ہماری معلومات میں مزید اضافہ کرتے رہتے ہیں۔

شبانہ بیگم (معلمہ)، اورنگ آباد (مہاراشٹر)

خواتین دنیا ماہ مارچ 2023 موصول ہوا۔

1۔ ساجدہ زیدی کی غزل گوئی جاننے کا موقع ملا۔

2۔ ایک پڑھی لکھی عورت بچوں، خاندان کے افراد، معاشرے اور وار قوم کے لیے مشعل راہ ہوتی ہے۔

3۔ شین مظفر پوری کے افسانوں میں عورت مختلف انداز میں اور کرداروں میں سامنے آتی ہے۔

4۔ اسلم مرزا بیگ بروقت وکیل، شاعر، ادیب، تاریخ داں، محقق، مترجم، نقاد اور مبصر ہیں انھوں نے پشتو کے عوامی نغموں سے اردو زبان و ادب کو معطر کیا۔

5۔ صفی اورنگ آبادی کا بنیادی موضوع حسن و عشق ہے۔

6۔ موتی لال ساقی نے کشمیریوں کے سامنے موجودہ سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل ایسے پیش کیے ہیں جیسے کوئی ماہر جغرافیہ کرے۔

7۔ شیخ علی وجودی اردو ناول میں ایسا کردار ہے جس کے اندر بے شمار منفی خصوصیات موجود ہیں۔

بشن چودھری، فتح آباد، پنجاب

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

انیس کے مرثیے (جلد اوّل ودوم)

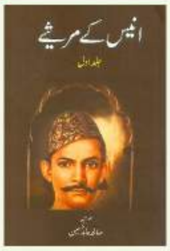

مرتبہ: صالحہ عابد حسین

تیسری اشاعت: 2022

صفحات: 504 (جلد 1)، 612 (جلد 2)

قیمت: 250 (جلد 1)، 275 (جل 2)

تاریخ طب (ابتدا تا عہد حاضر)

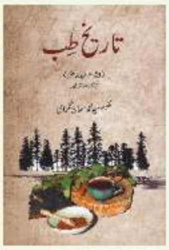

مصنف: حکیم سید محمد حسان نگرامی

ساتویں اشاعت: 2022

صفحات: 606

قیمت: 280 روپے

آب وہوا کا سائنسی مطالعہ

مصنف: طاہر حسین، میری طاہر

مترجم: فرحت عثمانی

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 435، قیمت: 220 روپے

دنیا کی بہترین کہانیاں

انتخاب وترتیب: گنگا پرساد وِمل

مترجم: فیروز بخت احمد

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 348، قیمت: 170 روپے

نظری تنقید: مسائل ومباحث

مرتبہ: عفت آرا

دوسری اشاعت: 2022

صفحات: 233

قیمت: 125 روپے

تاریخ طب یونانی (جلد دوم)

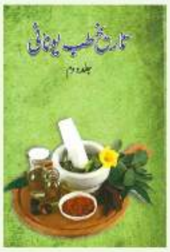

ادارہ

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 970

قیمت: 425 روپے

تشریح البدن (جلد سوم)

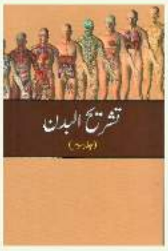

ادارہ

پہلی اشاعت: : 2022

صفحات: 455

قیمت: 210 روپے

انسانی حقوق

مصنف: خواجہ عبدالمنتقم

دوسری اشاعت: 2022

صفحات: 514

قیمت: 235 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

माहनामा ख्वातीन दुनिया मासिक, जुलाई२०२३ वर्ष:७, अंक:७

Mahnama Khawateen Duniya Monthly July 2023 ,Vol. 7, Issue: 7

National Council for Promotion of Urdu Language

Ministry of Education , Department of Higher Education, Government of India

RNI. No. DELURD/2017/74026
DL (S)-17/3555/2021-23
ISSN 2581-4826
Date of Publication: 13- 07-2023
Date of Dispatch : 14 and 15 of every month
Total Pages: 64

سوچھ بھارت

ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش وجستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظر عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.: sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad , Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025